# ضمیر فروش

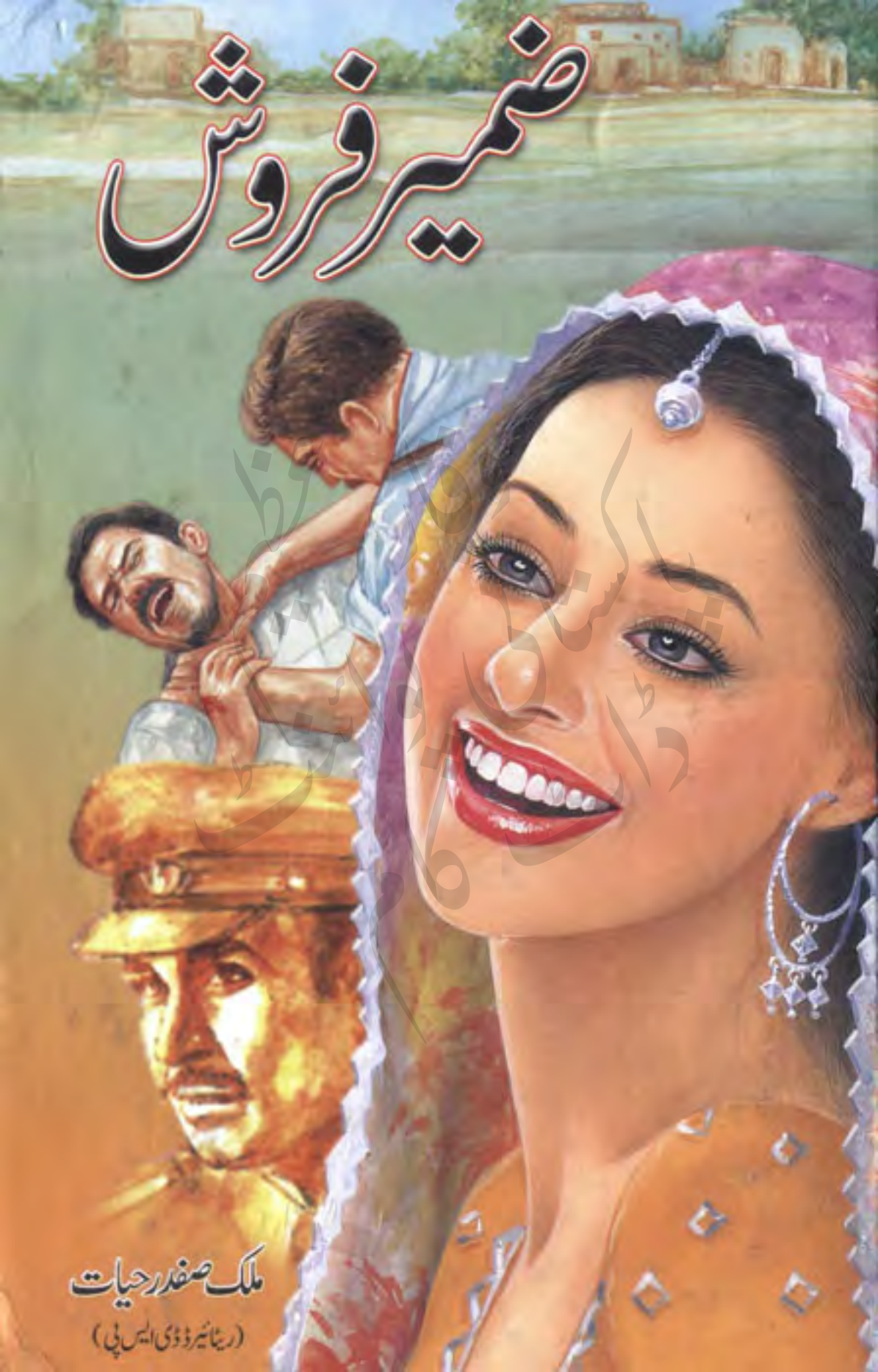

ملک صفدر حیات
(ریٹائیرڈ ڈی ایس پی)

# ترتیب


بیساکھی ..... 5

سیدھی چال ..... 69

ضمیر فروش ..... 123

گناہِ کبیرہ ..... 183

# بیساکھی

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ موسم کی شدت، کاروبارِ زندگی کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ دل یہی چاہتا ہے کہ گھر سے باہر قدم نہ نکالیں۔ ''جو ہوتا ہے، ہو جائے.....'' کا سوچ کر انسان کسی گوشۂ عافیت میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ لیکن میرے پیشے کے تقاضے ایسی من مانی اور تن آسانی کی اجازت نہیں دیتے۔ فرض کی راہ میں ہر رکاوٹ اور مشکل کو توڑ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ موسم کی خرابی اور حالات کی سنگینی میرے پیشے پر کسی بھی طور اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ بہرصورت، فرض کی ادائیگی لازم ٹھہرتی ہے۔

وہ موسمِ سرما کی ایک ٹھنڈی ٹھار صبح تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، جنوری کا پہلا یا دوسرا ہفتہ تھا۔ ان دنوں سردی اپنے عروج پر ہوتی ہے۔ اور اس سال تو موسمِ سرما بڑی آن بان سے وارد ہوا تھا۔ اکتوبر کے آغاز ہی سے فضا میں ٹھنڈک رچ بس گئی تھی۔ آثار و اطوار سے یہی لگتا تھا کہ اس بار موسمِ سرما، مارچ تک کھنچا چلا جائے گا۔ اس حوالے سے جنوری کا وسط بہت ہی کسمپرس اور شدید ہو گیا تھا۔ رگوں میں خون منجمد کر دینے والی سردی نے کاروبارِ حیات کے ساتھ ہی حواس اور احساسات کو بھی معطل کر کے رکھ دیا تھا۔

جیسا کہ میں اوپر ذکر کر چکا ہوں، میرا پیشہ ان حالات میں بھی کسی نرمی اور سستی کی اجازت نہیں دیتا، لہٰذا میں اس برفیلی صبح بھی حسبِ معمول تیار ہوا اور اپنی سیٹ پر جا بیٹھا۔ اگلے ہی لمحے حوالدار نبی جان میرے کمرے میں آ گیا۔

اُس کے چہرے پر گمبھیرتا دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس سے کوئی استفسار کرتا، وہ اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! اچھا ہوا، آپ آ گئے۔ ورنہ..... میں تو آپ کے کوارٹر کی طرف آ رہا تھا۔''

''کیوں بھئی؟'' میں پوری طرح حوالدار کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت نہیں ہے جناب!'' وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''آخر ہوا کیا ہے؟''

''ایک عورت قتل ہو گئی ہے، جناب!'' نبی جان نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''کون عورت؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''یہ قتل کہاں، کس جگہ ہوا ہے؟''

''عورت کا نام عابدہ بتایا جاتا ہے۔'' حوالدار وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اُس کی لاش اُدھر بیری والے کھوہ (کنوئیں) کے پاس پڑی ہے۔''

''بیری والا کھوہ!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''وہ کھوہ، جو ریلوے لائن کے اُس پار کھیتوں میں ہے؟''

''جی ہاں..... میں اُسی کھوہ کی بات کر رہا ہوں۔''

وہ تصدیقی انداز میں بولا۔

میں ان دنوں قصبہ رائے پور کے تھانے میں تعینات تھا اور یہاں میری تعیناتی کو ابھی صرف تین ماہ ہوئے تھے، لہٰذا میں یہ دعویٰ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں اس علاقے اور وہاں بسنے والے لوگوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ قصبہ دراصل ایک سڑک اور ریلوے لائن کے بیچ واقع تھا۔ ہمارا تھانہ سڑک کے کنارے، بس اسٹاپ کے ساتھ تھا۔ ریلوے لائن کی دوسری طرف سرسبز و شاداب کھیتوں کا ایک وسیع و عریض سلسلہ تاحدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ ریلوے لائن سے ایک کچی پگ ڈنڈی کھیتوں کی سمت جاتی تھی۔ مذکورہ بیری والا کھوہ اسی پگ ڈنڈی کے ساتھ تھوڑے فاصلے پر واقع تھا۔

میں نے حوالدار نبی جان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔ ''یہ عورت کے قتل کی اطلاع کون لے کر آیا ہے؟''



''آیا تھا.....!'' حوالدار نے ٹھوس انداز میں جواب دیا۔ اُس بندے کا نام مرتضیٰ ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی واپس گیا ہے۔ مرتضیٰ اسی قصبے کا رہنے والا ہے۔ اس کا گھر مقتولہ عورت کے گھر کے نزدیک ہی ہے۔ مرتضیٰ کے گھر میں کوئی مسئلہ ہے، اس لئے فوراً واپس چلا گیا۔''

''ہوں.....!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''مرتضیٰ نے مقتولہ عورت کے بارے میں اور کیا کیا بتایا ہے؟''

''اُس عورت کا نام عابدہ ہے۔'' نبی بخش نے جواب دیا۔ ''عمر تیس کے قریب ہے اور وہ ایک شادی شدہ عورت تھی۔ اُس کی ایک چار سالہ بچی بھی ہے۔ مقتولہ کا خاوند ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔''

میں نے پوری توجہ سے نبی جان کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر پوچھا۔ ''کیا اے ایس آئی سکندر علی آ چکا ہے؟''

''نہیں جناب!'' حوالدار نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''وہ آج ذرا دیر سے آئے گا۔ اس کا بچہ کل سے بیمار ہے۔ وہ رات جاتے ہوئے مجھے بتا کر گیا تھا۔''

اے ایس آئی سکندر علی کی رہائش اسی قصبے میں تھی۔ چنانچہ اگر تھانے میں کسی قسم کی ایمرجنسی نہ ہوتی تو وہ رات کو اپنے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ ایک شادی شدہ شخص ہے اور اس کا ایک بیٹا بھی ہے۔ لیکن یہ بات میرے علم میں نہیں تھی کہ سکندر علی کا بیٹا ساجد بیمار ہے۔

میں نے حوالدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''نبی جان! دس پندرہ منٹ میں نکلنے کی تیاری کر لو۔ تم میرے ساتھ وقوعہ پر جاؤ گے۔''

''اوکے، ملک صاحب!'' اس نے فرمانبرداری سے کہا اور میرے کمرے سے نکل گیا۔

نبی جان اپنے قد بت اور جسمانی ساخت سے پولیس والا نظر نہیں آتا تھا۔ اگر کوئی اسے یونیفارم کے بغیر دیکھتا تو اسے یقین نہ آتا کہ وہ پولیس والا ہے بلکہ..... حوالدار ہے۔ لیکن نبی جان اپنے ''کام'' کا ''ماہر'' اور بڑا مستعد پولیس اہلکار تھا۔

مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے لگ بھگ تین ماہ ہوئے تھے اور اس عرصے

کے دوران یہ پہلی سنگین واردات میرے ہاتھ لگی تھی، ورنہ اب تک تو چھوٹے موٹے جھگڑے اور چوری چکاری کے کیس ہی نمٹانے کا موقع ملا تھا۔ قتل کی اس واردات کا سن کر میرے رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور مجھے اُمید تھی کہ اس معاملے میں ہاتھ پاؤں کھولنے کا خوب موقع ملے گا۔ اس وقت میرا ذہن برق رفتاری سے مصروفِ عمل تھا۔

جیسے ہی نبی جان نے تیاری کی اطلاع دی، ہم دونوں تھانے سے نکل کر جائے وقوعہ کی سمت روانہ ہو گئے۔

نیم پختہ سڑک قصبے کے شمال میں اور ریلوے لائن جنوب میں واقع تھی۔ جب کہ بیری والا کھوہ، ریلوے لائن کے جنوب میں کھیتوں کے درمیان پگ ڈنڈی کے کنارے پر تھا۔ ہمیں جائے واردات پر پہنچنے میں بہ مشکل دس منٹ لگے ہوں گے۔

❁.....❁

اس کنوئیں کو ''بیری والا کھوہ'' اس لئے کہا جاتا تھا کہ وہ ایک قدیم اور کنگ سائز بیری کے نیچے واقع تھا۔ بیری کے درخت کی بہت سی شاخیں مذکورہ کنوئیں کے اوپر سایہ کئے ہوئے تھیں۔ جب میں حوالدار نبی جان کی ہمراہی میں موقع واردات پر پہنچا تو وہاں درجن بھر افراد کو موجود پایا۔ ان کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔ پولیس کو باوردی وہاں دیکھا تو وہ اِدھر اُدھر ہو گئے۔

میں فوراً عورت کی لاش کے قریب چلا گیا اور بہ غور اس کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ کنوئیں کی منڈیر کے ساتھ ہی کچھ زمین پر آڑھی ٹیڑھی پڑی تھی۔ پہلی ہی نظر میں مجھے یقین ہو گیا کہ زندگی اس سے روٹھ کر بہت دُور جا چکی ہے۔

میں نے مقتولہ کی عمر کا اندازہ اٹھائیس اور تیس کے درمیان لگایا۔ وہ بلا شبہ ایک حسین و جمیل عورت تھی۔ لیکن ان لمحات میں اس کی خوب صورتی اور رعنائی ماند پڑ چکی تھی۔ اس کے بدن پر سرخ رنگ کا فلانیل کا لباس تھا، جس پر چھوٹے چھوٹے سیاہ پھول بنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں بند جوتی تھی، جس کا رنگ سیاہ تھا۔ اس کی لاش کے قریب ہی گہرے نیلے رنگ کی ایک گرم شال بھی پڑی نظر آ رہی تھی۔ یہ شال، موت



کے منہ میں جانے سے قبل یقیناً اس نے اوڑھ رکھی تھی۔ مقتولہ کی ایک کلائی میں پیلے رنگ کی بلوری چوڑیاں نظر آ رہی تھیں اور دو تین ٹوٹی ہوئی چوڑیاں لاش کے قریب ہی زمین پر بھی پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے لباس اور زمین پر گرنے کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں، موت سے لڑتے ہوئے اس نے بڑی جدوجہد کی تھی۔ اس کا فلانیل کا لباس جگہ جگہ سے گرد آلود ہو رہا تھا۔

ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ فلانیل ایک گرم اُونی کپڑا ہوتا ہے، جسے گاؤں دیہات میں اور بعض اوقات شہروں میں بھی ''فلالین'' کہا جاتا ہے۔ فلالین، درحقیقت فلانیل کا بگاڑ ہے جو کہ غلط العوام ہے۔

میں، عابدہ کی لاش کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور بڑی باریک بینی سے اس کی گردن کا جائزہ لینے لگا۔

اس کی گردن کی حالت کسی نارمل گردن سے بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی اور پہلی ہی نگاہ میں مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ اسی گردن کو دبا کر عابدہ نامی اس عورت کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا تھا۔ میں نے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ لگا لیا کہ مقتولہ کی گردن دبانے کے لئے کسی مضبوط رسّی وغیرہ کا استعمال کیا گیا تھا۔ گردن کے محیط پر رسّی کے مخصوص دباؤ کے واضح اثرات دیکھے جا سکتے تھے۔

لاش کے تفصیلی معائنے کے بعد میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر حوالدار سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''نبی جان! تم جائے وقوعہ کے گرد و پیش کا اچھی طرح جائزہ لو۔''

''جو حکم، ملک صاحب!'' یہ کہتے ہوئے وہ اپنے کام میں جُت گیا۔

میں وہاں موجود لوگوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا۔

''تم میں سے اس بدنصیب کا رشتے دار کون ہے؟''

ہمارے آنے سے پہلے وہ لوگ عورت کی لاش کے قریب جمع تھے، مگر ہمیں دیکھتے ہی وہ کنوئیں سے دور ہٹ گئے تھے۔ میری پکار پر، پچاس پچپن سال کا ایک شخص آگے بڑھا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میرا نام وزیر علی ہے۔ میں عابدہ کا سسر ہوں جی۔''

وزیر علی متناسب قد اور بھاری جسم کا مالک تھا۔ رنگ سانولا اور توند نکلی ہوئی، سر کے بال کافی حد تک اُڑ چکے تھے۔ اس نے اپنے چہرے پر ہلکی سی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں وزیر علی سے کوئی سوال کرتا، ایک صحت مند شخص تیزی سے آگے آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔

''جناب تھانیدار صاحب! میرا نام راشد ہے۔ یہ عابدہ میری چھوٹی بہن ہے..... میرا مطلب ہے، یہ میری بہن تھی۔''

میں نے چونک کر باری باری وزیر علی اور راشد کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں میرے سوال کے جواب پر پورے اُترتے تھے۔ یعنی وہ مقتولہ کے قریبی رشتے دار تھے۔ راشد ایک مضبوط کاٹھی کا مالک تھا، رنگ گورا اور عمر چالیس کے اریب قریب تھی۔

یہ بات مجھے معلوم ہو چکی تھی کہ مقتولہ عابدہ اسی قصبے کی رہنے والی تھی اور اس کا خاوند روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر میں نے مقتولہ کے بڑے بھائی سے پوچھ لیا۔

''راشد! کیا تم بھی اِدھر رائے پور ہی میں رہتے ہو؟''

''جی ہاں!'' اُس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''ہم پچھلی تین پیڑھیوں سے اسی گاؤں کے وسنیک ہیں جناب! وزیر علی کا گھر جنوبی سمت ریلوے لائن کے قریب ہے اور میں شمالی جانب رہتا ہوں۔ آپ تھانے سے آئیں تو پہلے میرا گھر پڑے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تم دونوں سے بعد میں باری باری بات کروں گا۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''پہلے موقع کی ضروری کارروائی مکمل ہو جائے۔''

وہ دونوں خاموش ہو کر پیچھے ہٹ گئے لیکن میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ ان کے مابین کوئی خوشگوار تعلقات نہیں تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے نظر آتے تھے اور کوشش کر کے ذرا دور دور کھڑے ہوئے تھے۔ میں ان کی باہمی رنجش کو نوٹ کئے بنا رہ نہیں سکا تھا!

میں نے لوگوں کو موقع واردات سے اس لئے بھی دور ہٹا دیا تھا کہ عین ممکن تھا، مجھے قاتل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے کھرا وغیرہ اُٹھانے کی ضرورت پیش آ جاتی۔ میں نے موقع پر موجود دیگر افراد سے بھی پوچھ گچھ کی، لیکن وہ اس واقعے یا



قاتل کے حوالے سے کوئی اہم بات بتا نہ سکے۔

مجھے اُمید تھی کہ راشد اور وزیر علی سے ہونے والی بات چیت ضرور نتیجہ خیز ثابت ہو گی۔ ان دونوں کے دلوں اور ذہنوں میں پائے جانے والے تفاوت کو میں نے بڑی وضاحت سے نوٹ کیا تھا، جبھی میں نے ان سے الگ الگ بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ان کا مابینی تفاوت ضرور کوئی گُل کھلا دیتا۔

میں اس پوچھ تاچھ میں مصروف ہی تھا کہ حوالدار تیز قدموں سے چلتے ہوئے میری طرف آ گیا۔ اس کے چہرے سے دبا دبا جوش جھلک رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو نمایاں کر رکھا تھا اور مجھے اس کے ہاتھوں میں ایک رسّی دبی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ میرے قریب آ کر ہیجان خیز لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! یہ دیکھیں، کیا ملا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے مذکورہ رسّی میری طرف بڑھا دی۔

وہ ایک بٹی ہوئی ایسی رسّی تھی، جو عام طور پر چارپائی کی ادوائن وغیرہ کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ ہلکے بھورے رنگ کی اس رسّی کی لمبائی، میرے اندازے کے مطابق نو یا دس گرہ رہی ہو گی۔ تقریباً بیس بائیس انچ۔ میں مقتولہ کی گردن کا تفصیلی جائزہ لے چکا تھا، لہٰذا اس رسّی کو دیکھتے ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور پہلا خیال یہی اُبھرا کہ عابدہ کا گلا اسی رسّی کی مدد سے دبایا گیا ہو گا!

یہ میرا ایک فوری تاثر تھا۔ حالانکہ نبی جان نے اس حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی، تاہم میرے اس تاثر کے قیام میں حوالدار کے جوش و جذبے کا اغلب ہاتھ تھا۔ مجھے یقین تھا، وہ بھی میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے مذکورہ رسّی اس کے ہاتھ سے لے لی، پھر اسے اپنے ہاتھوں میں گھما پھرا کر نبی جان سے پوچھا۔

''یہ تمہیں کہاں سے ملی ہے؟''

''جناب! یہ کھوہ کی پرلی طرف سے ملی ہے۔'' یہ بتاتے ہوئے اس نے ریلوے لائن کی جانب اشارہ کیا۔ ''اُدھر کھیتوں میں یہ لگ بھگ بیس فٹ کے فاصلے پر پڑی تھی۔''

جو کچی پگ ڈنڈی ریلوے لائن سے کھیتوں کی سمت آتی تھی، اس کا زاویہ جنوب مغرب میں بنتا تھا اور بیری والا کھوہ مذکورہ پگ ڈنڈی سے مغرب میں تیس فٹ کے فاصلے پر واقع تھا۔ جب کہ رسّی کے حوالے سے حوالدار نے جس سمت اشارہ کیا تھا، وہ کھیتوں اور ریلوے لائن کا درمیانی حصہ تھا، یعنی کھوہ سے بیس فٹ دُور، ریلوے لائن کی جانب۔

اس زمانے میں فنگر پرنٹس اُٹھانے کا رواج نہیں تھا، یا یوں سمجھیں کہ رواج عام نہیں ہوا تھا۔ اور اگر کوئی پولیس آفیسر کسی طرح بھی کوشش کر کے یہ کام سرانجام دے بھی ڈالتا تو عدالت اس کی کارکردگی کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دیتی تھی، جیسا کہ آج کل دی جاتی ہے۔ اس ثبوت کو سرسری انداز میں لیا جاتا تھا، لہٰذا تفتیشی افسر فنگر پرنٹس کے بکھیڑوں میں پڑنا ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ میں نے حوالدار کے ذہن کا احوال جاننے کے لئے رسّی اُسے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

''نبی جان! کیا تمہارے خیال میں یہ رسّی آلۂ قتل کی حیثیت کی حامل ہو سکتی ہے؟''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے.....'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں تو اسی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ آپ نے مقتولہ کی گردن کی حالت دیکھی ہے نا؟''

''بڑی اچھی طرح دیکھی ہے، نبی جان!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

وہ معنی خیز انداز میں سر کو اثباتی جنبش دے کر رہ گیا۔

میں نے آئندہ چند منٹ میں، حوالدار کی مدد سے جائے وقوعہ کا نقشہ تیار کیا، پھر بیری والے کھوہ کے آس پاس کا وہ حصہ حصار زدہ بنا دیا، جہاں سے قاتل کے سراغ کے سلسلے میں کھرا وغیرہ ملنے کے روشن امکانات تھے۔ اس مقصد کے لئے میں نے کھونٹے اور رسّی منگوا کر مطلوبہ حصے کے گرد ایک ''باڑ'' سی کھینچ دی۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے مقتولہ کی لاش کو سرکاری ہسپتال بھجوانے کا بندوبست کیا اور اس کے ورثا کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وزیر علی اور راشد ہی دو ایسی پارٹیاں تھیں، جن سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں کوئی ایسی بات سامنے آ سکتی تھی، جو قتل کے اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔



جیسا کہ میں نے پہلے ذکر کیا ہے، میں نے ان دونوں افراد کے درمیان اچھا خاصا تناؤ محسوس کیا تھا۔ یہی تناؤ اس مرحلے پر بھی ایک مسابقت کی صورت اُبھر کر سامنے آ گیا۔ راشد نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! پہلے آپ مجھ سے سوال و جواب کریں۔ عابدہ میری چھوٹی بہن تھی، میں آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکتا ہوں کہ اس بے چاری کے ساتھ کیا ہوا ہو گا۔''

''وہ میرے بیٹے کی گھر والی تھی۔'' وزیر علی نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میری بہو اور میری اکلوتی پوتی کی ماں تھی۔ آپ اس کے بارے میں پہلے مجھ سے پوچھ گچھ کریں جی۔''

''آپ لوگ آپس میں جھگڑا نہ کریں، ورنہ اصل معاملہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تم دونوں کو بولنے کا پورا موقع دوں گا، لیکن ایک اصول کے تحت۔''

''کیسا اصول جی؟'' وزیر علی نے اُلجھن زدہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے متحمل لہجے میں کہا۔

''موسم کی سختی اس بات کی اجازت اور رعایت نہیں دیتی کہ یہاں کھلی فضا میں کچہری لگا کر مزید قیام کیا جائے۔ ہمیں کسی گھر کے اندر بیٹھ کر صبر و سکون سے بات کرنا چاہئے، لہٰذا.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''لہٰذا.....جس کا گھر، جائے وقوعہ سے قریب ہے، پہلے میں اس کا بیان لوں گا۔ اس کے بعد دوسرے کی باری آئے گی۔''

میرا فیصلہ سن کر وزیر علی مطمئن دکھائی دینے لگا۔ کیونکہ قرعۂ سوال اُس کے نام نکل آیا تھا۔ وہ ریلوے لائن کی دوسری طرف رہتا تھا، جبکہ راشد کا گھر قصبے کے دوسرے سرے پر، میرے تھانے کے نزدیک تھا۔ وہ اس فیصلے پر برا سا منہ بنا کر رہ گیا، تاہم زبان سے کچھ نہ کہا۔

میں نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''راشد! مجھے پوری طرح اس بات کا

احساس ہے کہ یہ سانحہ تمہارے لئے کتنا تکلیف دہ ہے۔ میں تمہارے دُکھ درد میں برابر کا شریک ہوں۔ تم اطمینان سے اپنے گھر جاؤ۔ میں وزیر علی سے فارغ ہو کر سیدھا تمہارے پاس آتا ہوں۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا تم لوگوں سے وعدہ ہے کہ میں بہت جلد عابدہ کے قاتل کو گرفتار کر کے عدالت کے حوالے کر دوں گا اور اپنی سی کوشش کر کے اسے ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گا کہ تم لوگوں کے کلیجے ٹھنڈے ہو جائیں۔ میں جان ہارنے والی عابدہ کو تو واپس نہیں لا سکتا، لیکن اس کے قاتل کو تلاش کر کے کیفرِ کردار تک پہنچانا میرا فرض ہے۔"

میرے ان مبنی بر حقیقت عزائم نے دونوں پارٹیوں کو مطمئن کر دیا۔ میں وزیر علی اور راشد کو دو پارٹیاں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان کے درمیان خفگی اور ناراضگی کی ایک لکیر سی کھنچی دیکھی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا، اس لکیر کی مضبوطی اور اہمیت کیا ہے۔ یہ تو ان کے بیانات قلم بند کرنے کے بعد ہی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ صورتِ حال کیا ہے! اپنے اس مقصد تک رسائی حاصل کرنے کے لئے میں مقتولہ عابدہ کے سسر وزیر علی کے ہمراہ اس کے گھر کی جانب روانہ ہو گیا۔

❁.....❁

حوالدار نبی جان کو میں نے مقتولہ کی لاش کے ساتھ سرکاری ہسپتال روانہ کر دیا تھا، لہٰذا اس وقت میں اکیلا ہی تھا۔ نبی جان ہسپتال سے فارغ ہونے کے بعد سیدھا تھانے آ جاتا۔ وزیر علی کا گھر ریلوے پٹری پر کھڑے ہو کر دیکھا جا سکتا تھا۔ ریلوے لائن اور اس کے گھر کے درمیان کم و بیش پچاس، ساٹھ گز کا فاصلہ رہا ہو گا۔ اگر آپ کو ٹرین میں بیٹھ کر سفر کرنے کا اتفاق ہوا ہے تو آپ نے ریلوے لائن کے آس پاس اس نوعیت کے گاؤں دیہات آباد ضرور دیکھے ہوں گے۔ وہ ایک لوکل ٹرین کا ریلوے ٹریک تھا، جو دن میں صرف ایک مرتبہ وہاں سے گزرتی تھی۔ زیادہ تر مال گاڑیوں نے ہی اس پٹری کو اپنی گزرگاہ بنا رکھا تھا۔

وزیر علی کا گھر ایک روایتی کچا مکان تھا۔ ریلوے لائن کی طرف پائے جانے والے



اکثر مکانات کے آگے چھوٹے موٹے باغیچے اور سبزیوں وغیرہ کی کیاریاں بنی دکھائی دیتی ہیں۔ گاؤں دیہات کے لوگ بہت سی اشیائے ضرورت میں خود کفیل ہوتے ہیں اور گنتی کی چیزیں انہیں خریدنا پڑتی ہیں۔ ان کاموں کے لئے ان میں ذوق و شوق بھی ہوتا ہے اور ان کے پاس وافر وقت بھی موجود ہوتا ہے۔ شہر کی زندگی اتنی مصروف ہوتی ہے کہ بعض اوقات شیو بنانے اور کپڑے استری کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ سبزی ترکاری گھر میں یا گھر کے باہر اُگانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اعتدال، انسانی زندگی کی صحت کے لئے بہت ضروری ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں توازن ہونا چاہئے۔ ہم چند چیزوں کو حاصل کرنے کے لئے اتنی تیز رفتاری سے بھاگتے ہیں کہ بہت سی اشیاء سے محروم رہ جاتے ہیں جن میں صحت اور سکون سرِفہرست ہے۔ اس محرومی میں صحت کا قصور ہے، نہ سکون کا اور نہ ہی کسی اور کا۔ انسان دراصل اپنی ہی خواہشات اور فیصلوں کا اسیر ہے!

یہ مجھے راستے ہی میں پتہ چل چکا تھا کہ وزیر علی ایک دکاندار ہے۔ قصبے کے مین بازار میں اُس کی پرچون کی دکان تھی۔ گھر میں بسنے والے افراد کی تعداد بھی محدود تھی۔ یعنی خود وزیر علی، اس کی بیوی ملکہ، بہو عابدہ (جو اب اس دنیا کو چھوڑ کر اُس دنیا کی باسی ہو چکی تھی)، عابدہ کی چار سالہ بیٹی فاخرہ اور بس.....وزیر علی کا اکلوتا بیٹا مشتاق، روزگار کے سلسلے میں پاکستان سے باہر گیا ہوا تھا۔ وزیر علی نے بتایا کہ وہ عراق میں ہے اور کسی میکینکل فرم میں کام کرتا ہے۔

وزیر علی نے مجھے اپنے گھر کی بیٹھک میں بٹھایا۔ اس کی بیوی ملکہ بھی وہیں آ گئی۔ فاخرہ اپنے ہم عمر بچوں کے ہمراہ باہر کھیل رہی تھی۔ وہ اس سانحے کی حقیقت اور سنگینی سے ظاہر ہے، اس طرح آگاہ نہیں تھی، جیسے کوئی عاقل بالغ انسان ہو سکتا ہے۔

ملکہ کی عمر پچاس کے آس پاس نظر آتی تھی۔ وہ گول چہرے والی ایک گوری چٹی اور فربہ عورت تھی۔ بعد ازاں تفصیلی گفتگو کے نتیجے میں مجھے معلوم ہوا کہ پہلے بیٹے مشتاق کی پیدائش کے وقت کوئی پیچیدگی پیدا ہو گئی تھی اور یوں آئندہ کے لئے ماں بننے کی صلاحیت سے محروم ہو گئی تھی۔ مشتاق ان کی اکلوتی اولاد تھا اور پچھلے تین سال سے وہ عراق میں تھا۔

ملکہ اور وزیر علی، عابدہ کی الم ناک موت پر بڑے غم زدہ نظر آتے تھے۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اس سانحے کے حوالے سے ہمدردی کا اظہار کیا اور ان سے وعدہ کیا کہ میں بہت جلد ان کی بہو کے قاتل کو نہ صرف ڈھونڈ نکالوں گا، بلکہ اُسے کیفرِ کردار تک بھی پہنچاؤں گا۔

ملکہ نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ عابدہ کو کس نے قتل کیا ہے!''

''سمجھ میں آ جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے اس بات کا پتہ چلانا ہوگا کہ آپ لوگوں کی بہو بیری والے کھوہ تک پہنچی کیسے؟ وہ اپنی مرضی سے گئی یا اسے زبردستی وہاں لے جایا گیا؟ وہ وہاں کس سے ملنے گئی تھی.....وغیرہ وغیرہ!''

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اور.....اسی طرح کے دیگر سوالات کے جواب آپ مجھے دیں گے۔ کیونکہ مقتولہ آپ کے پاس، آپ کے گھر میں رہتی تھی۔ یہ تو ممکن نہیں کہ آپ کو کچھ پتہ ہی نہ ہو!''

''میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، تھانیدار صاحب!'' وزیر علی نے گھگیائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میرے دماغ میں کچھ نہیں آ رہا، یہ سب کیا اور کیسے ہو گیا۔''

''ایک بات تو طے ہے کہ آپ کی بہو کو گلا دبا کر موت کے گھاٹ اُتارا گیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کی گردن کی حالت تم نے بھی دیکھی ہے، وزیر علی! مقتولہ کی لاش جس آڑے ٹیڑھے انداز میں کچی زمین پر بے ترتیب پڑی تھی، اس سے اندازہ ہوتا ہے، زندگی کو الوداع کہتے ہوئے اس نے موت سے لڑنے کی بھرپور کوشش کی تھی، یہ الگ بات ہے کہ اس کی پیش نہ چلی اور قاتل اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔''

میں نے ایک مرتبہ پھر ایک لمحے کی خاموشی اختیار کی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ لوگ مجھ سے تعاون نہیں کریں گے تو اس کیس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آئے گا۔ میں نے راشد کے تیور دیکھے ہیں، وہ آپ لوگوں سے خاصا خفا نظر آتا



ہے۔ یہ نہ ہو کہ اس کا کوئی بیان آپ کو کسی بڑی مصیبت میں مبتلا کر دے، لہٰذا.....''

میں نے سنسنی خیز انداز میں توقف کیا، پھر کہا۔

''لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ مجھ سے کچھ نہ چھپائیں۔ حقیقت سے آپ لوگ جس حد تک واقف ہیں، مجھے بھی آگاہ کر دیں..... بہ صورتِ دیگر مجھے راشد کی بات بڑی توجہ سے سننا پڑے گی اور اس کی بات پر کان بھی دھرنا پڑیں گے!''

میرے انداز میں ایک خاص قسم کی دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ وہ مجھے بھول کر پریشان نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں کے تاثرات سے واضح ہوتا تھا کہ وہ خود کو کسی بڑی مصیبت میں گھرا محسوس کر رہے ہیں۔ فوری طور پر میں فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کوئی اہم بات مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے تھے یا پھر انہیں واقعی کسی بات کا علم نہیں تھا.....! اُنہیں متذبذب، فکرمند اور اُلجھا ہوا دیکھا تو میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''میں مقتولہ کے کمرے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔''

میری تقلید میں وزیر علی بھی کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں جی۔''

میں اُس کے پیچھے چل پڑا۔ وزیر علی کا گھر لگ بھگ پانچ مرلے قطعہ زمین پر بنا ہوا تھا۔ کراچی کے رہائشی اسے ایک سو تیس گز کے پلاٹ پر تعمیر شدہ مکان سمجھ لیں۔ مکان کے ابتدائی حصے میں ایک چھوٹی سی بیٹھک بنی ہوئی تھی، جہاں سے میں ابھی اُٹھا تھا۔ بیٹھک کے پہلو میں ڈیوڑھی یعنی گھر کا داخلی راستہ تھا۔ بیٹھک میں آمد و شد کے لئے دو دروازے تھے۔ ایک ڈیوڑھی کی جانب اور دوسرا گھر کے صحن کی طرف۔ گھر کا صحن اور برآمدہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے تھے۔ نسبتاً نیچی چھت والا باورچی خانہ اور غسل خانہ وغیرہ صحن والی دیوار کے ساتھ تعمیر کئے گئے تھے، جبکہ برآمدے کے اختتام پر دو کمرے بنے ہوئے تھے، جن میں ایک مربع شکل کا اور دوسرا مستطیل صورت کا تھا۔ چوکور کمرے میں وزیر علی اور اس کی بیوی ملکہ کی رہائش تھی، جب کہ لمبوترے کمرے میں مقتولہ عابدہ اپنی چار سالہ بیٹی فاخرہ کے ساتھ رہتی تھی۔ وزیر علی مجھے عابدہ کے کمرے میں لے آیا۔

وہ کمرا اپنے اندرونی ماحول اور اشیاء کے حوالے سے بالکل ویسا ہی تھا، جیسا کہ گاؤں دیہات کے گھروں کے کمرے ہوا کرتے ہیں۔ کمرے کے وسط میں دو چارپائیاں پہلو بہ پہلو بچھی ہوئی تھیں اور دیگر ساز و سامان بھی اپنی اپنی جگہ پر رکھا نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں آمدورفت کے لئے صرف ایک دروازہ تھا۔ دروازے والی دیوار میں ایک بڑی سی کھڑکی بھی موجود تھی۔ یہ کھڑکی اور دروازہ باہر صحن میں کھلتے تھے۔

مقتولہ کے کمرے کے سامنے والی دیوار پر ایک فریم شدہ تصویر بھی آویزاں تھی، جس میں ایک مرد اور ایک عورت جڑ کر بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ عورت کو تو میں نے فوراً پہچان لیا، وہ مقتولہ عابدہ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔ جبکہ تصویر میں نظر آنے والا مرد یقیناً مقتولہ کا شوہر مشتاق تھا۔ میں نے اپنے اندازے کی تصدیق کی خاطر فریم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وزیر علی! کیا یہ تمہارا بیٹا مشتاق ہے؟''

''آپ نے بالکل ٹھیک پہچانا ہے، تھانیدار صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ فوٹو ان کی شادی کے فوراً بعد کی ہے۔ اس وقت تک فاخرہ پیدا نہیں ہوئی تھی۔ فاخرہ ان کی شادی کے دو سال بعد اس دنیا میں آئی تھی۔ اب ماشاءاللہ! وہ پورے چار سال کی ہو گئی ہے۔''

''اور مشتاق کو عراق گئے لگ بھگ تین سال ہو گئے ہیں؟'' میں نے پھولے ہوئے گالوں والے مشتاق کی تصویر کو گھورتے ہوئے کہا۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق، مشتاق ایک پستہ قامت اور فربہ شخص ہونا چاہئے تھا۔

وزیر علی نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جی ہاں..... فاخرہ ایک سال کی تھی، جب مشتاق کو ملک سے باہر جانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس پر زور دیا کہ وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں ایک لمحے کی دیر نہ لگائے۔ اگر وہ چند سال ملک سے باہر لگا آئے گا تو اس کی زندگی بن جائے گی۔ میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ عراق چلا گیا۔''

''کیا ان تین سالوں میں، تمہارا بیٹا ملنے کے لئے پاکستان آیا ہے؟'' میں نے وزیر علی سے سوال کیا۔



یہ اُس دور کا واقعہ ہے، جب بیرونِ ملک جا کر روزی کمانے کے رجحان کا ابھی آغاز ہوا تھا، خاص طور پر گاؤں دیہات میں رہنے والوں کے لئے یہ بالکل ایک نیا اور سنسنی خیز تجربہ تھا۔ عام طور پر لوگ لیبر میں جاتے تھے، بہت کم ہی ایسے ہوتے تھے، جنہیں کسی ٹیکنیکل شعبے میں قسمت آزمائی کا موقع ملتا تھا۔ اور مشتاق انہی خوش نصیبوں میں سے ایک تھا۔ وہ عراق کی کسی میکینکل فرم میں مشین مین کی حیثیت سے ملازم تھا۔

وزیر علی نے جواب دیا۔

''نہیں جناب! وہ ان تین سالوں میں ہم سے ملنے کے لئے ایک مرتبہ بھی یہاں نہیں آیا۔ البتہ دو تین ماہ میں اس کی خیر خیریت کا خط آ جاتا ہے اور جواب میں ہم بھی اسے خط لکھ دیتے ہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ وہ پانچ سال کا عزم لے کر عراق گیا تھا اور پروگرام یہی تھا کہ ان پانچ سالوں میں وہ خوب محنت کرے گا، وہ اتنا جمع کر لے گا کہ یہاں واپس آنے کے بعد اسے کسی قسم کی محتاجی نہیں رہے گی، وہ بڑی آسانی سے کوئی بھی کاروبار شروع کر لے گا، لیکن.....'' اُس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک افسردہ سی سانس خارج کی، پھر دل گرفتہ لہجے میں بولا۔

''لیکن اس واقعے کے بعد تو مشتاق کو پاکستان آنا ہی پڑے گا۔ میں آج یا کل کسی وقت بڑے ڈاک خانے جا کر مشتاق کو تار (ٹیلی گرام) بھیجتا ہوں، تاکہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو، یہاں آ جائے۔''

وزیر علی کے ادا کئے ہوئے ایک ایک لفظ سے پریشانی ٹپکتی تھی۔ قتل کی اس واردات نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں نے اس کی کیفیت کے پیشِ نظر دوستانہ لہجے میں کہا۔

''وزیر علی! تمہارا بیٹا جس عراقی میکینکل فرم میں کام کرتا ہے، اس کا نام پتہ تو ہو گا، تمہارے پاس؟''

''جی بالکل ہے۔'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے مشتاق کے سارے خط سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں۔ شروع کے خطوط میں اس نے اپنی کمپنی کے بارے میں بڑی تفصیل سے لکھا تھا۔ کمپنی کا نام، ایڈریس، فون نمبر وغیرہ..... سب ہے میرے پاس محفوظ۔''

"شاباش.....!" میں نے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ "تم مجھے اس کی فرم کا نام اور ٹیلی فون نمبر لکھوا دو۔ میں ہیڈ کوارٹر سے یا ایس پی صاحب کے دفتر سے تمہارے بیٹے کو فون کر کے یہاں کے حالات سے آگاہ کر دوں گا، ٹیلی گرام وغیرہ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔"

اس نے تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھا لیکن زبان سے کچھ نہیں بولا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وزیر علی! میں ایک مرتبہ پھر نرمی سے پوچھ رہا ہوں کہ اگر تم اپنی بہو کو پیش آنے والے واقعے کے بارے میں ذرا سا بھی جانتے ہو تو خاموش نہیں رہو۔ مجھے تفتیش کی گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کے لئے کوئی اشارہ چاہئے۔"

وہ متذبذب انداز میں بولا۔

"تھانیدار صاحب! عابدہ کا تو کوئی دشمن بھی نہیں تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا، وہ گھر سے کیسے نکلی اور بیری والے کھوہ پر کیا لینے گئی تھی، جو کسی نے اس کی گردن دبا کر زندگی سے محروم کر دیا۔"

"وزیر علی! جس انداز میں تمہاری بہو کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا ہے، وہ کسی دوست کا کارنامہ نہیں ہو سکتا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پتہ ہو یا نہ ہو، لیکن میں یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔ میں پہلی فرصت میں اس دشمن تک پہنچنا چاہتا ہوں، تاکہ یہ پتہ چلایا جا سکے کہ اس قتل کی اصل وجہ کیا ہے۔ مجھے تو یہ لگتا ہے، وزیر علی....."

میں نے دانستہ جملہ نامکمل چھوڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ اضطراری لہجے میں مستفسر ہوا۔

"آپ کو.....کیا لگتا ہے.....تھانیدار جی.....؟"

"مجھے یہ لگتا ہے کہ تمہاری بہو اپنی مرضی سے بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اکیلی یا کسی کے ہمراہ.....اس حقیقت کا بہت جلد پتہ چلا لیا جائے گا۔ میں نے جائے وقوعہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ کھوجی کی مدد سے جب کھرا اُٹھایا جائے گا تو صاف پتہ چل جائے گا، پچھلی رات وہاں کس کس شخص کے فٹ پرنٹ



(قدموں کے نشانات) پہنچے تھے۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ میں یہ جاننے میں کامیاب ہو جاؤں گا کہ تمہاری بہو کب، کیسے اور کیوں بیری والے کھوہ پر گئی تھی!"

میری ان سنگین باتوں نے اس کی پریشانی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ وہ گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "سوہنا رب خیر کرے جی۔"

"سوہنا رب تو ہمیشہ خیر ہی کرتا ہے، وزیر علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "لیکن یہ انسان بڑا ظالم اور فتنہ پرور ہے۔ اسے کسی کروٹ چین نہیں آتا۔ نت نئے ہنگامے کھڑے کرتا رہتا ہے!"

میرے ان معنی خیز جملوں کے جواب میں وہ کچھ نہیں بولا۔ پتہ نہیں کیوں، مجھے اندر سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وزیر علی کو اس واردات کے حوالے سے کوئی ایسی بات پتہ ہے، جو اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ اب یہی کہا جا سکتا تھا کہ یا تو اسے بھی اس نکتے کی اہمیت کا اندازہ نہیں تھا اور یا پھر وہ دانستہ مجھ سے چھپا رہا تھا، یعنی ایک لحاظ سے وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا، بہ الفاظِ دیگر وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

اگر وہ دیدہ و دانستہ اس حرکت کا مرتکب ہو رہا تھا تو یہ اس کی سنگین غلطی تھی۔ کیونکہ جب کوئی انسان جانتے بوجھتے ہوئے جھوٹ بولتا ہے تو اس کے پیش نظر دو یا ان دو میں سے ایک مقصد ضرور ہوتا ہے۔ نمبر ایک، وہ کسی خطرناک جرم کا ارادہ کر چکا ہوتا ہے۔ نمبر دو، وہ اپنے کسی بھیانک جرم کی پردہ پوشی کر رہا ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ مجرم کے خانے میں فٹ ہوتا ہے۔ اگر وزیر علی بھی اسی خانے کا باسی تھا تو میں مستقبل قریب میں اس کا حشر نشر کرنے والا تھا۔

میں نے اسے کریدنے کی کوشش کرتے ہوئے، عام سے لہجے میں کہا۔ "تمہارا اور تمہاری بیوی کا نام کچھ عجیب سا نہیں ہے؟"

"عجیب سا کیوں جی؟" وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ "بیوی ملکہ اور شوہر وزیر۔ تمہیں یہ کیسا لگتا ہے کہ وزیر کی بیوی ملکہ.....ہوں؟"

"جناب! دراصل ملکہ تو بادشاہ کی ہوتی ہے اور وزیر، بادشاہ کا نائب۔" وہ اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ سارا چکر ناموں کی وجہ سے ہے۔ میں کسی بادشاہ کا وزیر نہیں، لیکن میرا نام وزیر علی ہے۔ ملکہ کسی بادشاہ کی نہیں بلکہ میری بیوی ہے۔"

"اچھا، ٹھیک ہے۔" میں نے اس سلسلے میں نام کے وزیر کو زیادہ اُلجھانا مناسب نہ سمجھا اور معتدل لہجے میں کہا۔ "اگر تم کہتے ہو کہ یہ محض ناموں کا چکر ہے تو میں تمہاری ہی بات کو درست مان لیتا ہوں۔"

میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی کہ وزیر علی کے لئے جواب دینا لازم ٹھہرتا۔ وہ خاموش اور اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔ میں نے سوالات کے حلقے کو تنگ کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"وزیر علی! آج کل تم لوگ رات کا کھانا کتنے بجے کھا لیتے ہو؟"

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے بولا۔ "آج کل موسمِ سرما اپنے عروج پر ہے، اس لئے سارے کام جلدی جلدی کرنا پڑتے ہیں۔ شام (مغرب) کی نماز کے بعد ہم کھانے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں۔"

"مغرب کی نماز کے بعد....." میں نے مقتولہ کی خواب گاہ سے واپس بیٹھک کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "یعنی زیادہ سے زیادہ چھ بجے تک؟"

"جی ہاں!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "یہی کوئی چھ، سوا چھ بجے۔"

"اس کا مطلب ہے....." میں نے برآمدے میں سے گزرتے ہوئے کہا۔ "سات بجے تک تو تم لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے ہو گے؟"

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلائی۔ میں نے بیٹھک میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ رات کے کھانے کے بعد کیا کرتے ہو؟..... میرا مطلب ہے کہ فوراً سو جاتے ہو یا.....؟"

ہم ملکہ کو بیٹھک میں چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ بھی ہمارے بعد وہاں سے نکل گئی تھی۔ وہ ہمارے پیچھے کمرے میں تو نہیں آئی، ہوسکتا ہے باورچی خانے میں گھس کر ہماری باتیں سننے کی کوشش کر رہی ہو۔



بہرحال، جب ہم بیٹھک میں واپس آئے تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ تاہم قبل اس کے کہ وزیر علی میرے سوال کا جواب دیتا، ملکہ کی آواز سنائی دی۔

"تھانیدار جی! میں آپ کو بتاتی ہوں۔"

میں نے پلٹ کر عقب میں دیکھا، ملکہ ایک چھوٹی سی بچی کے ساتھ ہماری ہی طرف آ رہی تھی۔ بچی کی عمر کم و بیش چار سال رہی ہو گی۔ وہ ایک گوری چٹی اور گول مٹول بچی تھی، جس کے گھنگھریالے بال بڑے خوب صورت نظر آتے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ وہ مقتولہ کی اکلوتی بیٹی فاخرہ ہے۔

مجھے بچی کی جانب یک ٹک دیکھتے پا کر ملکہ نے تصدیقی لہجے میں کہا۔ "یہ میری پوتری (پوتی) فاخرہ ہے۔ کافی دیر سے باہر بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ آج بڑی غضب کی سردی ہے، اس لئے اسے اپنے ساتھ اندر لے آئی ہوں۔" وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"بچے بڑے معصوم اور ننھے منے ہوتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں، یہ کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں کہ انہیں ذرا بھی سردی نہیں لگتی۔ ہم بڑے سردی سے ٹھٹھر رہے ہوتے ہیں مگر ان بچوں کو ذرا بھی پروا نہیں۔ ان میں بے پناہ قوتِ برداشت ہوتی ہے۔"

"قوتِ برداشت نہیں، ملکہ! بلکہ بے پروائی اور لاابالی پن کہو۔" میں نے دلکش نقوش والی فاخرہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ اپنے کھیل کود میں اس حد تک مگن ہوتے ہیں کہ انہیں موسم کی سختیوں کا ذرا بھی احساس نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو یہاں تک بے نیاز ہوتے ہیں کہ انہیں اپنی ماں کی موت کا بھی ادراک نہیں ہو پاتا۔"

میرے آخری جملے نے ان دونوں میاں بیوی کو بے حد ملول و افسردہ کر دیا۔ تاہم ننھی فاخرہ ٹکر ٹکر ہم سب کی صورتیں دیکھنے لگی۔ میں نے صورتِ حال کی غمزدگی کو کم کرنے کی غرض سے اضافہ کیا۔

"اسی لئے بزرگ کہتے ہیں کہ بچوں میں منافقت، مصلحت اور ریاکاری نہیں ہوتی۔ وہ تن اور من کے سچے ہوتے ہیں۔ ان کی ذات میں خدا جھلکتا ہے۔"

ملکہ نے نظر اُٹھا کر میری طرف دیکھا، میں نے کہا۔ "ملکہ! تم مجھے کچھ بتانے والی تھیں؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے فاخرہ کے ننھے منے، ٹھنڈے ٹھار ہاتھوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر کر گرم کیا، اس سے کہا کہ وہ باہر جائے، پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔

''وہ جی.....آپ نے وزیر علی سے جو پوچھا تھا، میں اسی بات کا جواب دینے والی تھی.....کہ ہم رات کے کھانے کے بعد کیا کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ بتاؤ۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ بولی۔

''وزیر علی تو اُدھر برآمدے میں چارپائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے، ہم تینوں باورچی خانے میں چولہے کے پاس بیٹھ کر کھاتی ہیں۔ کھانے کے بعد تھوڑی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ اس دوران عابدہ برتن دھوتی تھی اور میں فاخرہ کے ساتھ قصے کہانیاں کرتی تھی۔ پھر ہم سونے کے لئے اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے تھے۔''

''سونے سے پہلے میں گھر کا بیرونی دروازہ کبھی بند کرنا نہیں بھولا۔'' وزیر علی نے مزید بتایا۔ ''دروازے کو اندر سے کنڈی لگانے کے بعد ہی مجھے اطمینان ہوتا ہے۔''

''کیا صبح تمہی دروازے کی کنڈی کھولا بھی کرتے تھے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہ کام میرے ہی ذمے ہے۔ جب مشتاق گھر میں تھا تو میں کبھی اس سے کہہ کر بھی یہ کام کروا لیا کرتا تھا۔ پچھلے تین سال سے تو مجھے ہی کنڈی چڑھانا اور اُتارنا پڑ رہی ہے۔''

''کیا کل رات کو بھی سونے سے پہلے تم نے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی تھی؟''

''جی..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے رات کو دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی تھی اور اپنے کمرے میں آ گیا تھا، پھر ہم سو گئے تھے۔''

''پچھلی رات، لگ بھگ کتنے بجے تم نے کنڈی چڑھائی تھی؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت آٹھ بجے ہوں گے۔''

''جب تم بیرونی دروازے کو کنڈی لگانے گئے تو اس وقت تمہاری بہو سو چکی تھی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔



''سو چکی تھی یا جاگ رہی تھی، اس بات کا تو مجھے کچھ پتہ نہیں جناب!'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''ہاں، یہ جانتا ہوں کہ عابدہ اور فاخرہ اس وقت اپنے کمرے کے اندر جا چکی تھیں۔''

''تم نے گھر کے بیرونی دروازے کو کنڈی چڑھائی اور اپنے کمرے میں آ گئے۔'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا، پھر تیز لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم اپنے کمرے میں آنے کے بعد فوراً ہی سو گئے تھے یا تمہیں دیر سے نیند آئی تھی؟''

''جناب! میں دن بھر دکان میں اس قدر تھک جاتا ہوں کہ رات دیر تک جاگنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''جب مشتاق یہاں تھا تو دکانداری میں میری مدد کیا کرتا تھا، اب تو مجھ اکیلے ہی کو سارا کام سنبھالنا پڑتا ہے جناب!''

''تم نے گزشتہ رات کم و بیش آٹھ بجے گھر کے بیرونی دروازے کو اندر سے کنڈی لگائی اور اپنے کمرے میں آ کر سونے کے لئے بستر پر لیٹ گئے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر خیال انگیز لہجے میں کہا۔ ''اور پھر تم فوراً ہی سو گئے.....یعنی ساڑھے آٹھ یا زیادہ سے زیادہ نو بجے تک تم گہری نیند میں جا چکے تھے؟''

''جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔ ''پچھلی رات میرے سر میں درد بھی ہو رہا تھا۔ میں نے ملکہ سے کہا کہ وہ میرا سر دبا دے۔ یہ ہلکے ہلکے میرا سر دبانے لگی۔ مجھے ایسا سکون ملا کہ پتہ ہی نہ چلا، کب میں سو گیا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں وزیر علی کو چھوڑ کر اس کی بیوی ملکہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''پچھلی رات، جب وزیر علی سو گیا تو اس کے بعد تم کیا کرتی رہی تھیں؟''

''میں نے کیا کرنا تھا جی۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''جب وزیر علی کے خراٹوں کی آواز اُبھرنے لگی تو میں بھی اپنی چارپائی پر جا کر لیٹ گئی تھی۔''

''کیا تمہیں لیٹتے ہی نیند آ گئی تھی؟''

''نہیں جی!'' اس نے نفی میں گردن جھٹکی اور بتایا۔ ''میں تھوڑی دیر تک جاگتی رہی تھی۔''

"تھوڑی دیر تک.....!" میں نے بدستور گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "دس منٹ، بیس منٹ، تیس منٹ؟"

"میرا خیال ہے، میں کوئی آدھے گھنٹے تک جاگتی رہی تھی۔" ملکہ نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "اس آدھے گھنٹے میں تم نے گھر کے اندر کسی قسم کی آواز اُبھرتے سنی تھی؟ خاص طور پر صحن یا بیرونی دروازے کی جانب سے؟"

"نہیں جی، میں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی تھی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں سمجھ رہی ہوں، آپ یہ سوال کس حوالے سے کر رہے ہیں۔" وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔ "آپ یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہیں نا، کہ اگر عابدہ خود ہی گھر سے نکلی تھی تو میں نے اس کے جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی ہوگی..... ہے نا؟"

"تمہارا اندازہ بڑی حد تک درست ہے، ملکہ!" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ "لیکن اس سلسلے میں مجھے کوئی ابہام یا غلط فہمی نہیں کہ عابدہ خود اپنی مرضی سے گئی تھی۔ اگر اس کے ساتھ کسی قسم کی زور زبردستی کی گئی ہوتی تو اس کے آثار گھر کے مختلف حصوں میں ضرور دکھائی دیتے اور وہ ہنگامہ مچتا کہ آپ دونوں لمبی تان کر پڑے سوتے نہ رہتے۔"

"یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، جناب!" وزیر علی، گمبھیر انداز میں بولا۔ "گھر کے اندر یا باہر کسی قسم کی ابتری یا افراتفری نظر نہیں آئی، جس کا مطلب ہے....."

"جس کا مطلب ہے....." میں نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ "کہ تمہاری بہو عابدہ اپنی مرضی سے گھر سے نکلی تھی!"

وہ دونوں متعجب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

میں نے پوچھا۔ "اس گھر میں صبح سب سے پہلے کون اُٹھتا ہے؟"

"میں۔" وزیر علی نے جواب دیا۔ "عام طور پر میں ہی پہلے اُٹھتا ہوں۔ میں ملکہ کو جگاتا ہوں اور ملکہ جا کر عابدہ کو اُٹھاتی ہے..... میرا مطلب ہے، اُٹھاتی تھی۔ اب تو وہ کبھی نہ اُٹھنے کے لئے سو چکی ہے۔"



بات کے اختتام پر اس کی آواز بھرا گئی۔ میں اس کے صدمے کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا، لیکن میں اس دکھ کو کم کرنے کے لئے فوری طور پر ان کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

"وزیر علی! کیا آج صبح بھی تم ہی سب سے پہلے اُٹھے تھے؟"

"نہیں جی، آج ملکہ کی آنکھ مجھ سے پہلے کھل گئی تھی اور اس کی بھی ایک وجہ ہے۔" وہ میرے سوال کے جواب میں بتانے لگا۔ "جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ رات میرے سر میں درد ہو رہا تھا، اس لئے جب مجھے نیند نہ آئی تو میں بے خبر سویا اور اپنے وقت پر صبح اُٹھ نہ سکا۔ ملکہ نے میرا سر دبا کر مجھے ایسی پُرسکون نیند میں پہنچا دیا تھا کہ میں معمول کے مطابق جاگ نہ سکا۔"

"ملکہ نے تمہیں جگایا اور پھر وہ عابدہ کو اُٹھانے چلی گئی۔" میں نے واقعات کی حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ پھر ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ "کیا عابدہ تمہیں اپنے کمرے میں مل گئی تھی؟"

"نہیں جناب! وہ کمرے میں موجود نہیں تھی۔" اس نے جواب دیا۔ "فاخرہ گہری نیند سو رہی تھی۔ عابدہ کو کمرے میں نہ پا کر مجھے حیرت تو ہوئی لیکن پھر میں نے سوچا کہ شاید وہ باتھ روم میں ہو۔ میں واپس اپنے کمرے میں آ رہی تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ میں کمرے کی طرف آنے کے بجائے دروازے کی طرف بڑھ گئی....."

ملکہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی تو وزیر علی نے کہا۔ "میں رات کو دروازے کی کنڈی چڑھا کر سویا تھا، لیکن جب صبح دستک کی آواز سن کر ملکہ دروازے پر پہنچی تو اس کی کنڈی کھلی ہوئی تھی۔ جب ملکہ نے دروازہ کھولا تو سامنے مجید کمہار کھڑا تھا۔"

"مجید کمہار؟" میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یہ مجید کمہار کون ہے؟ اور وہ صبح ہی صبح تمہارے دروازے پر کیا لینے آ گیا تھا؟"

وزیر علی نے جواب دیا۔ "مجید کمہار بھی اسی قصبے میں رہتا ہے اور وہ ہمیں عابدہ کی لاش کے بارے میں بتانے آیا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے، عابدہ کی لاش کو سب سے پہلے مجید کمہار نے دیکھا تھا؟"

میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔

''جی ہاں!'' وزیر علی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اُدھر بیری والے کھوہ کے قریب ہی پگ ڈنڈی کے دوسرے کنارے پر ایک چھپڑ (گندے پانی کا تالاب، جوہڑ وغیرہ) ہے۔ اس چھپڑ میں دن بھر مال مویشی نہاتے ہیں یا پھر عورتیں اپنے کچے گھروں کی لیپائی پوتائی (لیپاپوتی) کے لئے مٹی نکالتی ہیں۔ مجید کمہار بھی مٹی کی تلاش میں اُدھر چکر لگاتا ہے۔ آج تڑکے جب.....'' وہ لمحے بھر کے لئے رکا، ایک گہری سانس لی، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آج صبح جب مجید کمہار اپنے گدھے اور کتے کے ہمراہ چھپڑ کی طرف گیا تو کتے نے بیری والے کھوہ کے قریب پہنچتے ہی بھونکنا شروع کر دیا۔ پھر جلد ہی کتے کے بھونکنے کا سبب بھی سمجھ میں آ گیا۔ وہ بے زبان جانور، عابدہ کی لاش دیکھ کر بھونک رہا تھا۔''

وزیر علی یہاں تک بتانے کے بعد خاموش ہو گیا۔ مجید کمہار کا نام پہلی مرتبہ سامنے آیا تھا۔ اس سے پہلے مرتضیٰ کا نام سننے میں آیا تھا۔ یہ وہ شخص تھا، جو اس واقعے کی اطلاع دینے تھانے پہنچا تھا اور میری آمد سے پہلے ہی تھانے سے نکل گیا تھا۔ ان دونوں افراد کی حیثیت اس کیس میں اطلاع کنندگان ایسی تھی۔ اور مزے کی بات یہ تھی کہ میری ان دونوں اہم افراد سے ابھی تک ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ جائے وقوعہ پر وہ موجود نہیں تھے، ورنہ یہ بات مجھ سے چھپی نہ رہتی اور میں ان سے بھی کڑی پوچھ گچھ کرتا۔

میں نے وزیر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجید کمہار نے آ کر تمہیں بتایا کہ ادھر بیری والے کھوہ کے پاس تمہاری بہو کی لاش پڑی ہے۔ پھر اس گھر میں افراتفری مچ گئی۔ ایک بندے، جس کا نام مرتضیٰ ہے، کو تھانے کی طرف دوڑایا گیا تاکہ اس واقعے کی رپورٹ درج ہو سکے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ.....'' میں نے لمحے بھر کو توقف کیا، پھر وزیر علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کہ.....ابھی تک مجید کمہار یا مرتضیٰ سے میرا سامنا نہیں ہو سکا۔ حالانکہ ان دو اہم افراد کو تو جائے وقوعہ پر حاضر رہنا چاہئے تھا۔ کیا تم مجھے ان دونوں کے گھروں



کا پتہ بتا سکتے ہو؟''

''جی ضرور، ضرور۔'' یہ کہتے ہوئے وزیر علی نے میرے مطلوبہ دونوں افراد کے گھروں کی لوکیشن سمجھا دی۔

میں نے کہا۔ ''وزیر علی! مجھے اُمید ہے، تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہو گی۔ اس بات میں کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ تمہاری بہو اپنی مرضی سے گھر سے نکلی تھی۔ اب وہ کس مقصد سے بیری والے کھوہ تک پہنچی اور وہاں اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا، اس کا میں بہت جلد پتہ چلا لوں گا۔ ویسے ایک بات تو تم بھی تسلیم کرو گے کہ کوئی بہت ہی ضروری کام ہو گا، جو عابدہ اپنی چار سالہ بچی کو سوتا چھوڑ کر ٹھنڈی ٹھار رات کی خوف ناک تاریکی میں بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی۔''

وہ دونوں متذبذب اور اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگے۔ ان کے چہروں اور آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے واضح طور پر لہراتے دیکھے جا سکتے تھے۔ اس واقعے سے زیادہ میری باتوں نے انہیں سراسیمہ کر دیا تھا۔

اسی لمحے ننھی فاخرہ بیٹھک میں داخل ہوئی اور اپنی دادی کی گود میں چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی حرکات و سکنات سے نہیں لگتا تھا کہ اسے اپنی ماں کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کی خبر ہو گی۔ وہ بڑی مطمئن اور پُرسکون دکھائی دیتی تھی۔

میں نے ملکہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے، یہ بچی تمہارے ساتھ ہلی ہوئی ہے؟''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے، تھانیدار صاحب!'' وہ بڑے دُلار سے فاخرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''یہ صرف رات کو سونے کے لئے اپنی ماں کے پاس جاتی ہے۔ پچھلے سال اس کا دودھ بھی چھڑا دیا گیا ہے۔ اس کے بعد تو یہ ہر وقت میرے پاس ہی رہتی ہے، یا پھر باہر بچوں کے ساتھ کھیلتی رہتی ہے۔ ماں کی اسے زیادہ پروا نہیں ہوتی۔''

میں، ملکہ کے آخری جملے سے قطعاً اتفاق نہیں کر سکتا تھا۔ بچہ چاہے ایک دن کا ہو یا سو سال کا ہو جائے، ہر حال میں اسے اپنی ماں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پہلی سے آخری سانس تک وہ قدم قدم پر ماں کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ اس حقیقت کا

ادراک صرف انہی لوگوں کو ہے جو ماں ایسی ٹھنڈک سے محروم ہیں!

ملکہ نے ننھی فاخرہ کے حوالے سے جو کچھ بھی کہا تھا، وہ ایک دادی کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ فاخرہ کے لئے عابدہ کے وجود کو غیر ضروری سمجھی تھی۔

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وزیر علی سمجھ گیا کہ میں نے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہ بھی جلدی سے میری تقلید میں کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''ایک منٹ جناب!''

میں نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو مشتاق کی کمپنی کا پتہ اور فون نمبر چاہئے تھا نا..... آپ ایک منٹ رکیں، میں اس کے خط لے کر آتا ہوں۔''

میں رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد وزیر علی اپنے بیٹے کے خطوط کا پلندہ اُٹھا لایا۔ میں نے مشتاق کی میکینکل فرم کا پتہ اور فون نمبر وغیرہ اپنے پاس نوٹ کر لیا۔ ان کے گھر سے رخصت ہونے سے پہلے میں نے ننھی فاخرہ کو پیار کیا اور بھاری دل کے ساتھ گھر سے باہر نکل آیا۔

وزیر علی میرے ساتھ ہی باہر آیا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''عابدہ کی لاش کب تک ہمیں مل جائے گی؟''

''میرا خیال ہے، کل شام میں یا پھر پرسوں دن میں کسی وقت۔'' میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ویسے تم اپنے ذہن میں پرسوں کا دن ہی رکھو۔''

''اور آپ مشتاق کو کب فون کریں گے؟''

''یہ کام تو میں آج ہی کر دوں گا۔''

''اچھا ہے، مشتاق پرسوں تک پہنچ جائے۔'' وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تاکہ اس کی موجودگی میں لاش کے کفن دفن کا بندوبست کیا جا سکے۔''

''اِن شاء اللہ! ایسا ہی ہوگا۔'' میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وزیر علی نے بڑے بھرپور انداز میں میرا شکریہ ادا کیا اور میں وہاں سے رخصت ہو ہی رہا تھا کہ اے ایس آئی سکندر علی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔



❁.....❁

مقتولہ کے بھائی راشد کا گھر قصبہ رائے پور کے سامنے والے حصے میں واقع تھا۔ یہ جگہ میرے تھانے سے بہت قریب تھی۔ راشد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے میں نے اے ایس آئی سے استفسار کیا۔

''سکندر علی! تمہارے بیٹے کو کیا ہو گیا ہے؟''

''حکیم جی نے نمونیا بتایا ہے۔'' اس نے بھرّائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

''اب اس کی طبیعت کیسی ہے؟'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''حکیم نے علاج شروع کیا یا نہیں؟''

''علاج پچھلے دو دن سے جاری ہے، ملک صاحب!'' سکندر علی نے بتایا۔ ''کوئی واضح فرق تو محسوس نہیں ہوتا، لیکن حکیم جی بہت پُر اُمید ہیں۔ انہوں نے کہا ہے، آنے والے دو دن میں بچہ ٹھیک ہو جائے گا، لیکن مکمل صحت یابی میں آٹھ دس دن مزید لگیں گے۔''

''اللہ تمہارے بیٹے کو جلد از جلد صحت یاب کرے!'' میں نے دعائیہ انداز میں کہا۔

''آمین!'' اس نے صدقِ دل سے کہا۔

سکندر علی اسی قصبے کا رہائشی تھا، لہٰذا میں یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتا تھا۔ عابدہ کے قتل کے معمے کو حل کرنے کے لئے سکندر علی میری بھرپور مدد کر سکتا تھا۔ صبح وہ تھانے میں موجود نہیں تھا، ورنہ میں تو اسے ہی جائے وقوعہ پر اپنے ساتھ لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے ہمراہ، راشد کے گھر کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''سکندر علی! تمہیں پتہ تو چل چکا ہوگا، اس علاقے میں قتل کی ایک واردات ہو گئی ہے۔ وزیر علی کریانہ فروش کی بہو کو کسی نے گلا دبا کر موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ اُدھر بیری والے کھوہ کے پاس مقتولہ کی لاش پڑی ملی ہے۔''

''ملک صاحب! یہ سارے حالات میرے علم میں آ چکے ہیں۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''مجھے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ آپ نے مقتولہ عابدہ کی لاش کو حوالدار کے

ہاتھ پوسٹ مارٹم کے لئے سرکاری ہسپتال بھجوا دیا ہے۔ میں صرف جائے وقوعہ پر نہیں گیا، باقی ہر بات میرے علم میں ہے جناب!''

''جائے وقوعہ کے گرد رسّی کا حصار کھینچ کر میں نے اسے محفوظ بنا دیا ہے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اب تک میں نے اس کیس کے سلسلے میں جو کچھ پرتیت کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی سیدھی سادی قتل کی واردات نہیں، بلکہ اس خونیں واقعے کے پیچھے کوئی نہایت ہی اہم راز چھپا ہوا ہے اور یہ راز.....'' میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھا اور کہا۔

''یہ راز.....صرف تمہاری مدد ہی سے حل کیا جا سکتا ہے۔''

''میں ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں، ملک صاحب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''آپ مجھے ٹھیک ٹھیک بتائیں کہ کرنا کیا ہے؟''

''ہم اس موضوع پر تفصیلی بات شام میں کریں گے۔'' میں نے کہا۔

وہ اُلجھن زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اور تب تک ملک صاحب؟''

''تب تک ہم چند بنیادی کام نمٹائیں گے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں مقتولہ کے بھائی راشد کی طرف جا رہا ہوں، اس سے مختصر ملاقات کر کے میں تھانے جاؤں گا اور پھر مجھے ایس پی صاحب کے آفس جانا ہے۔ چند محکمہ جاتی کاموں کے علاوہ مجھے وہاں سے عراق ایک فون بھی کرنا ہے، تاکہ مقتولہ کے شوہر مشتاق کو اس سانحے کی اطلاع دی جا سکے۔ میری واپسی شام تک ہی ہو سکے گی اور اس دوران تم.....'' میں نے تھوڑا توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''تب تک تم بھی دو چار ضروری کام کر ڈالو، جن میں سے ایک کام تو دو بندوں کا تفصیلی انٹرویو کرنا ہے۔ مرتضیٰ اور مجید کمہار۔'' پھر میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اے ایس آئی کو ان دونوں اطلاع کنندگان کے بارے میں بتا دیا۔

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں ان دونوں بندوں کو اچھی طرح کرید لوں گا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ پھر پوچھا۔ ''مجھے اور کیا کرنا ہے؟''



''بابا جلال دین کو ڈھونڈ کر فوراً کام پر لگا دو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے جائے وقوعہ کو محفوظ کر دیا ہے۔ اس طرح جلال دین کا کام آسان ہو جائے گا۔ اس سے کہہ دینا کہ وزیر علی کے گھر سے لے کر بیری والے کھوہ تک کے راستے کو اچھی طرح کھنگالنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''آپ فکر نہ کریں، آپ کی غیر موجودگی میں، میں صورتِ حال کو اچھی طرح ہینڈل کر لوں گا۔ اور جب آپ واپس آئیں گے تو میں آپ کو اِن شاء اللہ! نتائج دوں گا۔''

''مجھے تم سے یہی اُمید تھی، سکندر علی!'' میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

جلال دین عرف بابا جلالا ایک عمر رسیدہ کھوجی تھا۔ دراز قامت، سانولی رنگت، ہاتھ پاؤں اور کاٹھی کا مضبوط۔ وہ بڑی مزے دار باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنے کام کا ایسا ماہر کہ کوئی دوسرا دُور دُور تک نظر نہیں آتا تھا۔ وہ زمین پر بیٹھ کر اپنی سرخ آنکھوں سے اس طرح مٹی کو گھورتا تھا، جیسے وہ زمین نہ ہو بلکہ کوئی دقیق اور خستہ حال وکہنہ سال کتاب ہو، جس میں مجرم کا نام بھول بھلیوں کے سے انداز میں درج ہو اور وہ اس معمے کو حل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں نے اے ایس آئی سکندر علی سے، اسی بابے جلالے کی خدمات حاصل کرنے کو کہا تھا۔

راشد بڑی بے تابی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی میں اس کے گھر پہنچا، اس نے مجھے ایک الگ کمرے میں بٹھایا اور گہری سنجیدگی سے موجودہ صورتِ حال پر گفتگو کرنے لگا۔ اس نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کر دیا۔

''ملک صاحب! کچھ پتہ چلا، میری بہن کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور اس کا قاتل کون ہے؟''

''ابھی تک قاتل کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملا۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وزیر علی اور اس کی بیوی ملکہ سے جو باتیں ہوئی ہیں، ان سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ وہ اس واقعے اور عابدہ کے قاتل کے بارے میں کچھ نہیں

جانتے۔ میں نے کھوجی کو کھرے کے کام پر لگا دیا ہے۔ اِن شاء اللہ! شام تک کوئی نتیجہ سامنے آ جائے گا۔"

"کھوجی تو اپنی جگہ کام کرتا ہی رہے گا، ملک صاحب!" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ وزیر علی پر توجہ دیں۔ یہ اتنا سیدھا نہیں جتنا اوپر سے نظر آتا ہے!"

اس کی بات نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ جائے وقوعہ پر بھی میں نے راشد کے تیوروں کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ وزیر علی سے خاصا نالاں اور خفا نظر آتا تھا۔ ان دونوں کے بیچ ضرور کوئی ایسا پیچ موجود تھا، جس کو کھولنا ضروری تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"راشد! تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

راشد کی عمر چالیس کے آس پاس تھی۔ وہ غلہ منڈی میں ایک آڑھتی حاجی مراد کا منشی تھا۔ لیکن اس واقعے کی وجہ سے وہ آج دکان پر نہیں گیا تھا۔ راشد کے باپ ارشد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ساٹھ سالہ بوڑھی والدہ اللہ رکھی اس کے ساتھ رہتی تھی۔ راشد کی بیوی کا نام بلقیس تھا۔ ان کی اولادوں میں دو بیٹے حفیظ اور عارف اور ایک بیٹی آمنہ تھی۔ آمنہ کی عمر آٹھ سال رہی ہوگی۔ دونوں بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ حفیظ سات اور عارف پانچ سال کا تھا۔ راشد اور بلقیس کی شادی کو دس سال ہو گئے تھے۔

میرے سوال کے جواب میں راشد نے بتایا۔ "جناب! اگر میرا بس چلے تو اس شخص کو میں اتنے جوتے ماروں کہ اس کے سر پر ایک بال نہ رہے۔ بے غیرتی اور کمینگی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ مگر اس نے تو ساری حدیں ہی توڑ ڈالی ہیں۔"

میں تو ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ راشد محض وزیر علی کو ناپسند کرتا ہے، لیکن راشد کے حالیہ غصیلے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس سے شدید نفرت کرتا ہے۔ یہ اس کیس کا ایک نیا، انوکھا اور سنسنی خیز زاویہ تھا۔ مجھے امید ہو چلی کہ اگر میں نے راشد کو اچھی طرح ہینڈل کر لیا تو کوئی نہ کوئی ایسا سرا ضرور میرے ہاتھ آ جائے گا، جسے تھام کر میں قاتل تک پہنچ سکوں گا۔ میں نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔

"راشد! تم مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وزیر علی سے تمہیں کیا شکایات ہیں؟"



"شکایات....." وہ اس اکلوتے لفظ کو چباتے ہوئے بولا۔ "جناب! بات شکوے اور شکایت کی نہیں ہے۔ انسان میں انسانیت ہونا چاہئے۔ اس بندے کا میری بہن کے ساتھ جو سلوک ہے، وہ بہت ہی غیر انسانی اور غیر اخلاقی ہے۔ میں..... میں....."

غصے کی شدت میں وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہو گیا۔ میں نے دیکھا، وہ اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو کھول بند کر رہا تھا۔ میں نے پچکارنے والے انداز میں کہا۔

"راشد! میں جاننا چاہتا ہوں کہ وزیر علی میں کون کون سی غیر اخلاقی اور غیر انسانی عادت ہے، خاص طور پر تم اپنی بہن عابدہ کے حوالے سے بتاؤ؟"

"وہ کمینہ..... میری بہن کے کردار پر شک کرتا تھا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"کردار پر شک؟" میں نے سوالیہ نظروں سے راشد کو دیکھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟ وہ عورت، جو اس کی بہو تھی اور اسی کے گھر میں رہتی تھی، وہ اسی کی ذات کو شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا؟ لیکن..... وہ ایسا لگتا تو نہیں!"

"تھانیدار صاحب! میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا کہ وہ بظاہر جتنا سیدھا اور شریف نظر آتا ہے، ایسا ہے نہیں۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ "اور اس مردود کی یہ خبیث خصلت بھی عابدہ کی شادی کے بعد ہی سامنے آئی تھی۔ ہم نے تو مشتاق کو دیکھ کر اس رشتے کے لئے ہامی بھر دی تھی۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے، اس کا پیٹھ پیچھا ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ مشتاق ہیرا آدمی ہے۔ وہ جب تک یہاں رہا، میری بہن کو کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوئی۔ لیکن اس کے عراق جاتے ہی ایک سے بڑھ کر ایک مسئلہ کھڑا ہونے لگا۔ میں نے تو سوچ لیا تھا، جناب! کہ اگر بات زیادہ بڑھی تو میں عابدہ کو اپنے گھر واپس لے آؤں گا۔ دو ماں بیٹی مجھ پر بوجھ نہیں بن سکتیں۔ جب مشتاق، عراق سے واپس آتا تو میں اسے اپنے پاس بٹھا کر بات کرتا۔ پھر جو بھی فیصلہ ہوتا مگر..... میں سوچتا ہی رہا اور میری بہن جان سے چلی گئی۔"

"عابدہ کی الم ناک موت ایک افسوس ناک واقعہ ہے، جس کا جتنا بھی سوگ منایا جائے، کم ہے۔" میں نے راشد کے زخموں پر الفاظ کا مرہم رکھتے ہوئے کہا۔ "میری یہ کوشش ہے کہ میں جلد از جلد تمہاری بہن کے قاتل تک پہنچ جاؤں۔ اس سلسلے میں

مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے، راشد! تمہاری مدد کے بغیر میں ایک اِنچ آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

صورت حال نے جیسی نازک اور حساس پٹری پکڑ لی تھی، اس کا تقاضا تھا کہ میں بڑی احتیاط کے ساتھ راشد کے دل اور دماغ کو ٹٹولوں تا کہ یہ ملاقات نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ میری بات کے جواب میں اس نے کہا۔

"جی، حکم کریں، آپ مجھ سے کس قسم کا تعاون چاہتے ہیں؟"

میں نے اپنے لہجے کو پُراسرار بناتے ہوئے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں کہا۔

"راشد! اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہماری آواز کمرے کے باہر سنی نہیں جا سکتی۔ لہٰذا تم بے فکری سے اپنے دل کی بات کہہ دو۔ کیا تم وزیر علی کو عابدہ کا قاتل سمجھتے ہو؟"

اس نے بڑی سرعت سے پلکیں جھپکائیں اور اضطراری لہجے میں بولا۔ "میرا یہ مطلب تو نہیں تھا، جناب!"

"گویا....." میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ وزیر علی، عابدہ کا قاتل نہیں؟"

"جناب.....!" وہ متذبذب لہجے میں بولا۔ "دراصل میں..... وزیر علی کے قاتل ہونے یا نہ ہونے کی بات نہیں کر رہا تھا..... میں تو اس کی کم ظرفی اور گھٹیا پن کے بارے میں آپ کو بتا رہا تھا۔"

"اچھا..... تو تم صرف یہ کہنا چاہتے تھے کہ وزیر علی کو تمہاری بہن کے کردار پر شک تھا؟" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"جی ہاں..... مجھے اس پر اسی بات کا غصہ ہے۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

"کیا اس حوالے سے اس نے کسی شخص کا نام بھی لیا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے، مقتولہ کے کردار کے حوالے سے؟"

"جی نہیں۔ ایسا کوئی نام سامنے نہیں آیا۔" وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"اور دکھ کی بات تو یہ ہے کہ اس مردود نے اس سلسلے میں مجھ سے بات نہیں کی، بلکہ ایک غیر کے سامنے بکواس کی اور اُڑتی اُڑتی یہ خبر میرے کانوں تک پہنچ گئی۔"



اب اس قتل کیس کہانی میں اہم موڑ آنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اہم سِرا میرے ہاتھ لگنے ہی والا ہے، جس کی تلاش میں، میں پچھلے کئی گھنٹے سے سر کھپا رہا تھا اور جس کے سہارے میں اپنے ہاتھوں کو قاتل کی گردن تک پہنچا سکتا تھا۔ میں نے راشد کو گھسنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس غیر شخص کا نام کیا ہے جس سے وزیر علی نے اپنی بہو یعنی تمہاری بہن کے بارے میں اُلٹی سیدھی باتیں کی تھیں؟"

راشد نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"اس بندے کا نام، اکرام اللہ ہے۔ اکرام اللہ، تمباکو کا کاروبار کرتا ہے اور اس کی دکان، وزیر علی کی دکان سے جڑی ہوئی ہے اور اتفاق دیکھیں کہ....." وہ لمحے بھر کے لئے رکا، ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"اسی اکرام اللہ کا گھر، میرے گھر کے برابر میں واقع ہے۔ وہ دکان داری میں وزیر علی کا پڑوسی ہے اور رہائش گاہی میں میرا پڑوسی ہے۔ بات جب مردوں کی زبان سے نکل کر عورتوں تک پہنچتی ہے تو اس کو سنبھال کر رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال اس معاملے میں بھی ہوا۔ اکرام اللہ نے اپنی بیوی سائرہ سے ذکر کیا، پھر یہ معاملہ میری بیوی تک پہنچا اور مجھے بھی خبر ہو گئی۔ یہ ہے ساری کہانی، جناب!"

"کہانی خاصی خطرناک اور اُلجھی ہوئی ہے، راشد!" میں نے مدبرانہ انداز میں کہا، پھر پوچھا۔

"جب یہ قصہ تمہارے علم میں آیا تو تم نے وزیر علی سے پوچھ تاچھ نہیں کی؟ کم از کم تمہیں اس معاملے کی تصدیق تو کرنا چاہئے تھی۔"

"جناب! میں پچھلے تین سالوں میں وزیر علی کے مزاج اور فطرت کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔ "مجھے پتہ تھا، اگر میں نے اس سلسلے میں اُس سے بازپُرس کی تو وہ ایک طوفان کھڑا کر دے گا۔ لہٰذا میں نے اس کے منہ لگنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے بھی....."

وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا، پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے بلقیس سے مشورہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ ہم مشتاق کی واپسی کا

انتظار کریں گے۔ وہ ایک سمجھ دار اور معقول انسان ہے، ہماری بات کو سمجھ جائے گا۔ اس کا وزیر علی پر بھی زور چلتا ہے۔ وہ اس معاملے کو اچھی طرح سنبھال سکتا تھا۔ وزیر علی سے اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"ہوں۔" میں نے پُرسوچ انداز میں ہنکاری بھری اور پوچھا۔ "کیا ان معاملات کا تمہاری والدہ اللہ رکھی کو بھی علم ہے؟"

"نہیں جناب!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "اماں کی عمر اور صحت اس قابل نہیں کہ میں اس معاملے میں اسے پریشان کرتا۔ ویسے بھی وہ بہت اونچا سنتی ہے۔ اسے اس سلسلے میں کچھ پتہ نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے راشد! تم نے تو وزیر علی کے منہ لگنا مناسب نہیں سمجھا، لیکن میں اس معاملے میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"اگر عابدہ کے کردار کے حوالے سے اس کے ذہن میں کچھ خدشات تھے تو اس کا ذکر مجھ سے کرنا چاہئے تھا۔ وزیر علی کے علاوہ میں اکرام اللہ سے بھی ایک بھرپور ملاقات کروں گا، تاکہ پتہ چلے کہ وزیر علی نے اس سے ایسی کوئی بات کی بھی تھی یا نہیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔"

"جناب! میں پولیس کے کام میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آپ جو مناسب سمجھتے ہیں، وہ ضرور کریں۔ میں تو چاہتا ہوں، آپ میرے تین کام کر دیں۔"

"کون سے تین کام؟" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

"نمبر ایک، میں چاہتا ہوں کہ میری بہن کے قاتل کو ایسی سزا ملے جو دیکھنے اور سننے والوں کے لئے عبرت ناک ہو۔ نمبر دو، میری خواہش ہے کہ ہسپتال سے عابدہ کی لاش سیدھی میرے گھر پہنچے اور میں اپنی مرضی سے اس کے کفن دفن کا بندوبست کروں۔ نمبر تین، میں چاہوں گا کہ عابدہ کی موت کے بعد فاخرہ میرے پاس رہے۔ میں اس ننھی سی بچی کو وزیر علی کے گھر میں چھوڑنے کو ہرگز تیار نہیں ہوں۔"

میں نے بچپن میں اپنے بزرگوں سے ایک دیو مالائی کہانی سن رکھی تھی، جس میں



تین خواہشات کا ذکر ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی کہانیاں آپ نے بھی سن رکھی ہوں گی۔ کہانی کسی بھی نوعیت کی ہو، اس کا انجام ایک ہی جیسا ہوا کرتا تھا۔ یعنی تین خواہشیں بھی پوری ہو جاتیں اور کچھ حاصل بھی نہ ہوتا۔ خواہش مند شخص مزید سے مزید اُلجھتا جاتا۔ شاید ایسی ہی صورتِ حال کے لئے شاعر نے کہا تھا۔ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے۔

جب راشد نے اپنی تین خواہشات کا ذکر کیا تو میرا ذہن لامحالہ اس طلسماتی کہانی کی طرف چلا گیا لیکن یہاں صورتِ حال نسبتاً مختلف تھی۔ لہٰذا میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔

"راشد! میری بات دھیان سے سنو۔ تمہاری پہلی خواہش تو میں ہر قیمت پر پوری کروں گا۔ عابدہ کا قاتل نہ صرف یہ کہ بہت جلد گرفتار ہوگا بلکہ وہ عبرت ناک سزا پا کر جیل کی آہنی سلاخوں پیچھے بھی چلا جائے گا۔ لیکن جہاں تک باقی دو خواہشوں کا تعلق ہے تو....." میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ فی الحال میرے اختیار میں نہیں ہیں۔ انہیں پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"کیوں جناب؟" وہ حیرت بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔

"راشد! تمہاری خواہش نمبر دو اس لئے پوری نہیں ہو سکتی کہ عابدہ اپنی سسرال میں رہ رہی تھی، جب اس کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ وہ اس کا، اس کے شوہر کا گھر ہے۔ لہٰذا ہسپتال سے اس کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش پہلے تھانے میں اور پھر تھانے سے وزیر علی کے گھر پہنچے گی۔ اور جہاں تک تمہاری خواہش نمبر تین کا تعلق ہے تو وہ مشتاق کی مرضی اور اجازت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ مشتاق، فاخرہ کا باپ ہے۔ اپنی اولاد کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار صرف اسی کو ہے۔ میرا خیال ہے، تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔"

"لل.....لیکن مشتاق تو عراق میں ہے....." وہ متذبذب لہجے میں بولا۔

"عراق میں ہے تو کیا ہوا؟" میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ "وہ ہمیشہ وہاں تو نہیں

رہے گا۔ میں اسے آج فون کر کے یہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کر دوں گا۔ دو تین دن بعد وہ تمہیں یہیں قصبہ رائے پور میں نظر آئے گا۔''

میری اس مدلل وضاحت کے بعد اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں بچا تھا۔ وہ بے بسی سے خلا میں گھورنے لگا۔ میں اس کے گھر سے نکل آیا۔

راشد سے ملاقات کے بعد ایک نیا قابلِ تفتیش کردار سامنے آیا تھا۔ اکرام اللہ نامی اس تمباکو فروش سے کڑی پوچھ گچھ کی جاتی تو سنسنی خیز انکشافات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں ذہن میں اس کیس کے تانے بانے بُنتے ہوئے تھانے پہنچا اور پھر ایس پی آفس چلا گیا۔ چند روز قبل ایس پی صاحب نے مجھے اپنے پاس بلایا تھا، لہٰذا وہاں جانا ضروری تھا۔ اس بہانے میں مشتاق کو فون کر کے تازہ ترین حالات سے آگاہ بھی کر سکتا تھا۔

❁.....❁

واپسی میں مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ جب میں تھانے پہنچا تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اے ایس آئی سکندر علی بڑی شدت سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنی کارگزاری کے بارے میں بتایا، پھر اس سے پوچھا۔

''سکندر علی! تمہارے کام کا کیا رہا؟''

اس نے جواب دیا۔

''ملک صاحب! میں نے آپ کے حکم کے مطابق، مرتضیٰ اور مجید کمہار کو تھانے بلا کر ان سے پوچھ گچھ کی ہے، لیکن وہ دونوں کسی ایسی بات سے واقف نہیں ہیں، جو اس قتل کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو۔'' وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''مجید کمہار کی تو صرف اتنی کہانی ہے کہ وہ حسب معمول چھپڑ سے مٹی نکالنے کے لئے اس طرف گیا اور اس نے بیری والے کھوہ کے پاس عابدہ کی لاش پڑی دیکھی۔ وہ سیدھا وزیر علی کے گھر پہنچا اور اسے اس واقعے کی اطلاع دی۔ مرتضیٰ تھانے میں اطلاع دینے کے بعد اس لئے جلدی گھر چلا گیا تھا کہ اس کے سسرالی رشتے داروں



نے کوئی تنازع ڈالا ہوا تھا۔ وہ بیوی کے معاملات کو نمٹانے میں پھنسا ہوا تھا، اس لئے زیادہ دیر تھانے میں رک کر آپ کی آمد کا انتظار نہیں کر سکا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''کھوجی جلال دین نے کیا رپورٹ دی ہے؟''

''جلال دین اندھیرا پھیلنے سے پہلے تک کام کرتا رہا ہے اور ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے رپورٹ دے کر گیا ہے۔'' سکندر علی نے بتایا۔ ''باقی کا کام وہ صبح کرے گا۔ ویسے اس نے جو کام کیا ہے، وہ خاصا تسلی بخش اور نتیجہ خیز ہے۔''

''ہاں بتاؤ.....اب تک کی کوشش میں بابے جلالے نے کیا تیر مارا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اس نے جواب دیا۔

''وزیر علی کے گھر سے بیری والے کھوہ تک مقتولہ عابدہ کا کھرا صاف مل گیا ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جائے وقوعہ پر پہنچی تھی اور اس کے ساتھ کسی اور شخص کا کھرا دستیاب نہیں ہو سکا۔ یعنی کسی ایسے شخص کا کھرا جو اس کی ہمراہی میں بیری والے کھوہ تک پہنچا ہو۔ اس کا مطلب ہے، گزشتہ رات وہ گھر سے نکلی اور اکیلی ہی بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی۔''

''اس بات کا اندازہ تو میں کھرا اُٹھوانے سے پہلے ہی لگا چکا تھا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اگر سچی بات کہوں تو مجھے یقین ہو چلا ہے، وہ کسی مرد سے ملنے بیری والے کھوہ تک گئی تھی۔ کس سے ملنے؟ کیوں ملنے؟ اور اسے قتل کیوں کیا گیا؟ اسے کس نے قتل کیا؟.....ان سوالات کے جوابات چاہئیں مجھے۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''جلال دین جائے وقوعہ کے بارے میں کیا رپورٹ دیتا ہے؟''

''جائے وقوعہ پر چار پانچ افراد کے فٹ پرنٹس ملے ہیں، جن میں صرف ایک مرد اور باقی سب عورتیں بہ شمول عابدہ..... کے قدموں کے نشانات ہیں۔ کھوہ پر عموماً عورتیں ہی پانی بھرنے جاتی ہیں، لہٰذا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ لیکن جلال دین نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا تھا کہ ایک بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی، لہٰذا پوری طرح

تصدیق کرنے کے بعد وہ اس کے بارے میں بتائے گا۔"

"وہ بات یقیناً اس مرد کے حوالے سے ہوگی جس کے قدموں کے نشانات بیری والے کھوہ پر پائے گئے ہیں۔" میں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ "شاید وہ انہی نشانات کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر پہنچنا چاہتا ہے!

"ایسی بات نہیں ہے جناب!" اے ایس آئی سنجیدگی سے بولا۔ "اس مرد کے قدموں کے نشانات کو تو جلال دین نے کوئی اہمیت نہیں دی۔ اسے یقین ہے، وہ کھرا تین چار روز پرانا ہے۔ لہٰذا گزشتہ رات والی واردات سے اس مرد کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔"

"اوہ.....!" میں نے متاسفانہ انداز میں سر کو مخصوص جنبش دی اور کہا۔ "تو کیا جلال دین کا یہ خیال ہے کہ پچھلی رات وہاں کوئی مرد گیا ہی نہیں؟..... کیا عابدہ کو کسی عورت نے قتل کیا ہے؟"

"میں نے عرض کیا نا، جناب!" سکندر علی نے آہستگی سے کہا۔ "جلال دین نے کوئی واضح بات نہیں کی۔ جو سوالات آپ کے ذہن میں اُبھر رہے ہیں، یہ میں نے بھی اس سے پوچھے تھے لیکن اس نے یہی کہا ہے کہ وہ صبح ایک مرتبہ پھر جائے وقوعہ کا جائزہ لے گا، اس کے بعد ہی کوئی فیصلہ کن بات کرے گا۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ کسی نکتے پر بری طرح اُلجھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے، سکندر علی!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں صبح تک انتظار کر لوں گا۔ دیکھتے ہیں، جلال دین کون سا سنسنی خیز انکشاف کرتا ہے، بلکہ..... میں کل اس کے ساتھ رہوں گا، پھر ساری صورتِ حال مجھ پر واضح ہو جائے گی۔"

"ہاں سر! یہ زیادہ مناسب ہوگا۔" سکندر علی نے تائیدی انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ "آپ مجھ سے کوئی ضروری بات کرنے والے تھے، بلکہ مجھے کوئی اہم ذمے داری سونپنے والے تھے؟"

"ہاں سکندر علی! میں نے راشد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے تم سے کہا تھا کہ شام میں ہم کسی اہم معاملے پر ڈسکس کریں گے۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے



ہوئے کہا۔ "اس وقت میرے ذہن میں صرف اتنا تھا کہ مقتولہ کا کسی مرد سے کوئی چکر ہو سکتا ہے۔ وہ اسی شخص سے ملنے بیری والے کھوہ پر گئی، پھر ان کے درمیان کوئی مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا اور اس شخص نے گردن دبا کر عابدہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ تم چونکہ اسی قصبے کے رہنے والے ہو، لہٰذا میرا خیال تھا، تم ایسے مرد کا سراغ لگانے کے لئے میری بھرپور مدد کر سکو گے، لیکن...."

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو سکندر علی نے اضطراری لہجے میں کہا۔ "لیکن کیا، ملک صاحب؟"

"لیکن یہ کہ....." میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اب صورتِ حال خاصی تبدیل ہو چکی ہے، بلکہ..... خاصی آسان ہو چکی ہے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں جناب!" وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"سکندر علی! مجھے صرف پہلے شک تھا، میرا اندازہ تھا کہ مقتولہ کسی مرد سے ملاقات کرنے بیری والے کھوہ پر پہنچی تھی، لیکن راشد سے ملاقات کے بعد میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی ہے۔ افسوس کہ وزیر علی نے مجھ سے ایک اہم بات چھپائی ہے۔ میں کل اچھی طرح اس کی خبر لوں گا۔"

"راشد نے ایسا کون سا انکشاف کیا ہے ملک صاحب؟" وہ متجسس نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں سکندر علی کو اس معاملے سے آگاہ کیا، جس کے ڈانڈے وزیر علی، اکرام اللہ، سائرہ، بلقیس اور راشد تک پھیلے ہوئے تھے۔ وزیر علی کو اپنی بہو کے کردار کے حوالے سے جو خدشات تھے، وہ اس نے اکرام اللہ کے گوش گزار کئے تھے۔ بات اکرام اللہ سے اس کی بیوی سائرہ تک پہنچی، سائرہ نے ڈھکے چھپے الفاظ میں بلقیس کی سماعت کو سیراب کیا اور عابدہ کا متنازعہ کردار، راشد تک پہنچ گیا۔ جبھی وہ وزیر علی سے شدید نفرت کرتا تھا اور اس دن کا منتظر تھا، جب مشتاق عراق سے واپس آئے تاکہ وہ اس سے فیصلہ کن بات کر سکے۔

"لیکن ملک صاحب!" سکندر علی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو

اچھا ہوا کہ ایک ایسا پہلو سامنے آ گیا، جو اس کیس کو حل کرنے میں مددگار ثابت ہو گا، مگر وہ شخص ہے کون جس کے حوالے سے وزیر علی کو اپنی بہو کا کردار میلا نظر آتا تھا؟ جب تک اس بندے کا پتہ نہ چلے، تفتیش کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

"میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں، سکندر علی!" میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ "اس شخص کی نشاندہی بہت ضروری ہے، جس سے ملاقات کرنے، رات کی تاریکی میں عابدہ بیری والے کھوہ پر گئی تھی۔ اس کے وہاں پہنچنے کا مقصد اتنا اہم تھا کہ وہ اپنی چار سالہ معصوم بچی کو سوتا چھوڑ کر گھر سے نکل گئی تھی۔"

میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"جہاں تک مذکورہ، مطلوبہ آدمی تک رسائی کا تعلق ہے تو یہ کام ہم دونوں مل کر کریں گے، سکندر علی! میں کل پہلی فرصت میں اکرام اللہ کی دکان پر جا کر اسے ٹٹولتا ہوں، پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ یہ پتہ چل جائے گا کہ راشد کے بیان کے مطابق، وزیر علی نے اپنی بہو کے کردار سے متعلق اکرام اللہ سے کوئی اُلٹی سیدھی باتیں کی تھیں یا نہیں۔ اگر کی تھیں تو وہ باتیں کیا تھیں۔ اس کہانی میں مرد کا کردار کس شخص نے ادا کیا تھا؟ اور اگر..... اکرام اللہ اس حوالے سے تردید کر دیتا ہے تو پھر وزیر علی کی ڈانٹ ڈپٹ کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ اس صورت میں، راشد کی گوشمالی ضروری ہو جاتی ہے، اور تم....."

میں نے ایک مرتبہ پھر توقف کر کے سانس کو ہموار کیا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم اپنی بیوی کو سائرہ کے پیچھے لگا دو۔ تم اسی علاقے میں رہتے ہو، تمہاری بیوی سائرہ کو اچھی طرح جانتی ہو گی۔ وہ اسے ٹٹول کر یہ معلوم کر سکتی ہے کہ کیا اس کے شوہر نے مقتولہ کے کردار کے حوالے سے کوئی قصہ سنایا تھا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا، سکندر علی؟"

"بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، ملک صاحب!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں عالیہ کو صبح ہی اس مہم پر لگا دیتا ہوں جناب! میری بیوی ٹوہ اور کھوج کے



معاملات میں مجھ سے بھی زیادہ پولیس والی ہے۔ مجھے امید ہے، وہ بڑی آسانی سے یہ کام کر لے گی۔ میں کل شام تک آپ کو کوئی بڑی خوش خبری سناؤں گا۔"

"بہت خوب!" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "عابدہ کی موت کے بعد یہ تحقیق زیادہ سہل ثابت ہو گی۔ اس کی ذات کے حوالے سے اکرام اللہ، زبان کھولنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرے گا اور نہ ہی سائرہ کسی مصلحت سے کام لے گی۔ سب کی یہی خواہش ہو گی کہ عابدہ کا قاتل جلد از جلد گرفتار ہو کر اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ ہم عابدہ کے قاتل سے زیادہ فاصلے پر نہیں کھڑے۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، ملک صاحب! میں بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔" سکندر علی گہری سنجیدگی سے بولا۔ "اگر مقتولہ سے منسوب شخص کا سراغ مل جائے تو قاتل تک رسائی کا مرحلہ آسان ہو جائے گا۔ مجھے تو ننانوے فیصد یہی امید ہے کہ وہی شخص عابدہ کا قاتل ہے۔"

"ایسا ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "بہرحال، دیکھتے ہیں، کل سورج ہمیں کیا دکھاتا ہے۔"

"بشرطیکہ سورج ہمیں نظر آ جائے۔" وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

سکندر علی کا اشارہ موسم کی ستم ظریفی کی جانب تھا۔ ان دنوں اس کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی کہ بعض اوقات گیارہ بجے تک سورج کی صورت دیکھنا نصیب نہیں ہوتی تھی۔ دُھند کی دبیز چادر پوری فضا کو اپنی بکل میں چھپائے بیٹھی نظر آتی تھی۔ لیکن یہاں سورج سے میری مراد کل دن کا آغاز تھا، نہ کہ سورج چمکتا ہوا دکھائی دینا۔

سکندر علی نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "ملک صاحب! کل کے دن کے لئے آپ کو مجھے ایک الاؤنس دینا ہو گا۔"

"کیسا الاؤنس، سکندر علی؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ بولا۔

"میں کل ڈیوٹی پر نہیں آؤں گا۔ آپ مجھے ایک دن کی چھٹی دیں گے۔"

"چھٹی کس لئے، سکندر علی؟" میری حیرت میں اضافہ ہو گیا۔ "تم چھٹی لے کر کل کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"جناب! یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ میرا بیٹا ساجد بیمار ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "کل سائرہ کو "رام" کرنے کے لئے عالیہ زیادہ وقت گھر سے باہر گزارے گی، لہٰذا ساجد کے پاس مجھے رُکنا پڑے گا۔ ہمارے گھر میں ہم تینوں کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔"

"ٹھیک ہے، کل تمہاری چھٹی پکی۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ "اور یہ چھٹی غیر حاضری کے کھاتے میں نہیں جائے گی، کیونکہ تمہاری جگہ کل عالیہ ڈیوٹی کرے گی.....یعنی وہ کارِ سرکار کے سلسلے میں اکرام اللہ کی بیوی پر کچھ "کام" کرے گی۔"

"تھینک یو، ملک صاحب!" وہ تشکرانہ لہجے میں بولا۔

میں زیرِ لب مسکرا کر رہ گیا۔

❁.....❁

میں اگلی صبح کی مصروفیات کے بارے میں سوچتے ہوئے سویا تھا، لیکن خلافِ معمول آدھی رات کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ وہ جنوری کے ابتدائی ایام تھے، یعنی لمبی راتوں کا موسم۔ چھ بجے تک چہار سُو گھپ اندھیرا پھیل جاتا تھا اور آئندہ صبح دور دور تک روشنی کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔

آدھی رات کے بعد آنکھ کھلنے کا مطلب یہ تھا کہ میں لگ بھگ ایک نیند لے چکا تھا اور آنکھ کا یوں کھل جانا خلافِ معمول تھا۔

میں رات کو سونے سے پہلے اپنے دماغ کو کچھ اس قسم کی ہدایات دیا کرتا تھا.....میں نہایت ہی پُرسکون، میٹھی اور گہری نیند سوؤں گا.....اور اذانِ فجر کے وقت میری آنکھ خود بہ خود ہشاش بشاش کھل جائے گی۔ لیکن اگر میری نیند کے دوران میں میرے ماحول کے اندر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش آیا یا پیش آنے کے آثار پیدا ہوئے تو میں وقت مقررہ سے پہلے ہی بیدار ہو جاؤں گا.....تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے ماحول میں کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی یا ہونے والی تھی!

اس خیال کے آتے ہی میں نے اپنی تمام تر توجہ ماحول پر مرکوز کر دی۔ اگلے ہی لمحے میں چونک اٹھا۔ باہر ایک مخصوص آواز اُبھر رہی تھی اور یہ آواز بارش کی تھی۔

میں نے بستر چھوڑ دیا اور تصدیق کی خاطر کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ



گیا۔ پھر اگلے ہی لمحے مجھے پتہ چل گیا کہ میری آنکھ بے سبب نہیں کھلی تھی۔ بارش واقعی ہو رہی تھی۔ اگرچہ اس کا زور زیادہ نہیں تھا، مگر جلال بابا کی محنت پر کامل "پانی پھرنے" کے لئے یہ بھی بہت کافی تھا۔

میرے ذہن میں پہلا خیال یہ پکا کہ کھوج اور کھرّے کا تو اب اللہ ہی حافظ ہے۔ یہ بارش کچے پکے تمام راستوں سے لوگوں کے قدموں کے نشانات کو صاف کر دیتی اور صبح جلال دین کو اپنا ہنر دکھانے کا موقع نہ ملتا۔

جلال دین کے تصور کے ساتھ ہی اے ایس آئی کی کہی ہوئی باتیں بھی ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ اس نے جلال دین کی اُلجھن کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ کل صبح کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنے والا تھا۔ میرے دل میں اس وقت شدت سے یہ خواہش اُبھری کہ کاش! بابا جلال دین میرے سامنے موجود ہو اور میں اس سے پوچھوں، اس کے ذہن میں کھرّے کے حوالے سے کیا اُلجھن ہے۔ مجھے اُمید تھی کہ وہ کسی ایسے نتیجے پر پہنچ چکا تھا، جو معمول کے کھرّے سے بہت ہٹ کر، بہت مختلف اور جدا تھا۔

بابے جلالے سے کل ہی ملاقات ہو سکتی تھی، لہٰذا میں دوبارہ جا کر بستر پر لیٹ گیا اور عابدہ کے قتل اور قاتل کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ کیس جتنا اُلجھے ہوئے اور پیچیدہ انداز میں شروع ہوا تھا، اتنی ہی جلدی حل ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اگر یہ بات ثابت ہو سکتی کہ وزیر علی نے واقعی عابدہ کے کردار کے حوالے سے اکرام اللہ سے کوئی نازیبا باتیں کی ہیں تو پھر منسوب شخص کا نام سامنے آنا لازم تھا۔ اور یہ نام منظرِ عام پر آتے ہی قاتل تک رسائی آسان ہو جاتی۔

یہ بات طے تھی کہ عابدہ، فاخرہ کو سوتے چھوڑ کر اگر آدھی رات کو سخت ترین سردی میں بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی تو اس میں اس کی کوئی بہت بڑی مجبوری رہی ہو گی، چاہے وہ مجبوری کسی بیرونی دباؤ کے نتیجہ میں ہو یا وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو!

خلافِ معمول اگر رات کے کسی پہر آنکھ کھل جائے تو دوبارہ نیند کی وادی میں اُترنا آسان ثابت نہیں ہوتا۔ اور میرے ذہن میں تو ایک سنسنی خیز قتل کا قصہ بھی چل رہا تھا، لہٰذا دوبارہ آنکھ لگنے میں کافی وقت صرف ہو گیا۔ اسی سبب صبح بیداری میں بھی تھوڑی تاخیر ہو گئی۔

میں حسبِ معمول روزمرہ کی مصروفیات سے فارغ ہونے کے بعد تیار ہوا اور ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا۔ اپنے فرائض منصبی انجام دیتے ہوئے مجھے عموماً ایک سہولت یہ میسر رہی ہے کہ میری رہائش، تھانے ہی کے احاطے میں بنے ہوئے سرکاری کوارٹر میں رہی، جو کہ تھانے کی اصل عمارت کے عقب میں بنا ہوتا ہے۔ اس رہائشی سہولت سے یہ آسانی رہی کہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے میں مجھے کبھی کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

بارش رات کے آخری پہر کسی وقت رک گئی تھی۔ یہ موسمِ سرما کی ابتدائی بارش تھی۔ اگرچہ اس کا زور اور دورانیہ نہایت ہی مختصر رہا تھا، مگر تھوڑی سی دیر ہی میں اس نے ٹھنڈک کی شدت میں بے پناہ اضافہ کر دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی کھوج کھرّے کے شعبے کو بھی بری طرح معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ البتہ اس کا ایک فائدہ بھی دیکھنے میں آیا اور وہ یہ کہ دُھند میں نمایاں کمی واقع ہو گئی تھی، جس کے سبب کئی دن کے بعد سورج کا منہ دیکھنا نصیب ہوا۔

اس روز اے ایس آئی سکندر علی چھٹی پر تھا۔ میں جلال دین کے انتظار میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، لہٰذا حوالدار نبی جان کو اپنے پاس بلا کر ضروری ہدایات دیں۔

''نبی جان!'' میں نے اس کی آمد پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں یا کچھ دیر کے بعد کھوجی جلال دین یہاں آئے گا۔ تم نے اسے کہیں جانے نہیں دینا۔ جب تک میں واپس نہ آ جاؤں، اسے تھانے ہی میں بٹھائے رکھنا۔ مجھے اس سے کوئی ضروری کام ہے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب!'' اس نے بڑی فرماں برداری سے اثبات میں گردن ہلا دی اور پوچھا۔ ''کیا آپ تھانے سے باہر کہیں جا رہے ہیں؟''

''ہاں، میں ذرا قصبے کے مین بازار کی طرف جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہاں کچھ کام ہے، جلدی واپس آ جاؤں گا۔''

''کیا آپ اکیلے ہی جائیں گے، یا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟''

''اگر تمہیں میں ساتھ لے کر جانا چاہتا تو پھر جلال دین کے حوالے سے خصوصی



ہدایات نہ دیتا، نبی جان!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آج سکندر علی تھانے نہیں آئے گا، لہٰذا تمہارا تھانے میں موجود رہنا ضروری ہے۔ کوئی ایک آدھ سینئر اہلکار تو یہاں موجود رہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''تم فکر نہ کرو، میں کانسٹیبل افتخار کو اپنے ساتھ لے کر جا رہا ہوں اور ہماری واپسی جلد ہو جائے گی۔''

اس کے بعد حوالدار نے کوئی سوال نہیں کیا اور میں ضروری تیاری کے بعد افتخار کے ہمراہ تمباکو فروش اکرام اللہ کی دکان کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس بات کے امکانات صفر کے برابر تھے کہ آج وزیر علی کی دکان کھلی نظر آئے۔ اس کے گھر میں جتنی بڑی قیامت برپا ہوئی تھی، اس کے بعد تو اس کی دکان کو ہفتہ، دس دن کے لئے بند رہنا ہی تھا۔

اور اس ہنگامی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اکرام اللہ کا بھرپور انٹرویو کر سکتا تھا، وزیر علی کی مداخلت کا دُور دُور تک امکان دکھائی نہیں دیتا تھا۔

❁.....❁

میں تھانے پہنچا تو بڑا پُرجوش تھا۔ اکرام اللہ سے ہونے والی ''ملاقات'' بڑی سودمند ثابت ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے تعاون کرنے میں کسی ہچکچاہٹ یا لیت و لعل سے کام نہیں لیا تھا۔ وزیر علی نے اپنی بہو کے کردار پر جس انداز میں اُنگلی اٹھائی تھی، اس کی تفصیل اکرام اللہ نے مجھے بتا دی۔ میں اس کے پاس سے سنسنی خیز اور انکشاف انگیز معلومات حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔ قاتل اب میری پہنچ سے زیادہ دور نہیں رہا تھا!

جب میں اپنے کمرے میں داخل ہوا تو اے ایس آئی سکندر علی کو اپنا منتظر پایا۔ اسے وہاں دیکھ کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ پروگرام کے مطابق آج وہ آن ڈیوٹی چھٹی پر تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں ساجد کا خیال آ گیا۔ میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ساجد کے بارے میں پوچھ لیا۔

''سکندر علی! تمہارے بیٹے کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''جی، اللہ کا شکر ہے۔'' وہ مطمئن انداز میں بولا۔ ''اب تو اس کا بخار تقریباً ختم

ہی ہو گیا ہے۔ سینے میں بھی وہ پہلے والی کھڑکھڑاہٹ اور گھٹن باقی نہیں رہی۔ حکیم جی کی دوا اپنا کام دکھا رہی ہے۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ حکیم جی کی دی ہوئی دوا اپنا کام دکھا رہی ہے۔" میں نے اے ایس آئی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔ "لیکن تم نے کیا کام دکھایا ہے؟ آج تو تم چھٹی پر تھے، پھر یہاں آمد کا کیا مطلب ہے؟"

"مطلب بڑا مفید اور نیک ہے، ملک صاحب!" وہ اپنے جوش کو دباتے ہوئے بولا۔ "میں نے جس مقصد کے لئے چھٹی لی تھی، وہ حاصل ہو گیا ہے۔"

میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، وہاں خاصی ہلچل اور سنسنی خیزی دکھائی دی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ کوئی بڑا میدان مار کر واپس آیا ہے۔ میں نے یہاں "بڑا میدان" محاورے کی ضرورت کے تحت استعمال کیا ہے۔

میں نے اے ایس آئی سے استفسار کیا۔ "سکندر علی! تم آخر کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"جناب! آپ نے جو کام عالیہ کے حوالے سے میرے ذمے لگایا تھا....." وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس کے آغاز کی نوبت ہی نہیں آئی۔ عالیہ کو پہلے سے اس معاملے کی خبر ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا، میری بیوی مجھ سے بھی زیادہ پولیس والی ہے۔ وہ عابدہ کے ایک خطرناک چکر سے آگاہ تھی۔ میں نے اس سلسلے میں اسے اعتماد میں لے کر جیسے ہی بات شروع کی، اس نے دوٹوک اور حتمی انداز میں کہہ دیا..... ہاں، یہ معاملہ تو کافی عرصے سے چل رہا ہے۔ میں عابدہ اور قادر بخش کے چکر سے واقف ہوں۔"

"قادر بخش؟" بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "کیا تمہاری بیوی نے قادر بخش ہی کا نام لیا تھا؟"

"جی ملک صاحب! میں غلط کیوں کہوں گا؟" وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے چٹانی لہجے میں کہا۔ "بس.....تو سمجھو پھر ہو گیا کام۔"

"کیا آپ کے پاس بھی قادر بخش کے حوالے سے کوئی اہم اطلاع ہے؟" سکندر علی نے پُرجوش انداز میں کہا۔ "آپ کی بات سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔"

"ہاں، سکندر علی! ایسی ہی بات ہے۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے



کہا۔ "میں ابھی اکرام اللہ کا "انٹرویو" کر کے آ رہا ہوں۔ اس نے بھی قادر بخش ہی کا نام لیا ہے۔ وزیر علی نے اس سے بات کرتے ہوئے اپنی بہو کے ساتھ قادر بخش کا نام ہی جوڑا تھا۔" میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس سے ظاہر ہوتا ہے، مقتولہ کے بڑے بھائی راشد کے مؤقف میں خاصا دم خم ہے۔ ہمیں پہلی فرصت میں اس قادر بخش کو شاملِ تفتیش کر لینا چاہئے۔"

"قادر بخش کا گھر، وزیر علی کے گھر سے زیادہ دور نہیں۔" اے ایس آئی نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ "ان دونوں کے گھروں کے بیچ میں صرف تین گھر اور واقع ہیں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں ابھی قادر بخش کو پکڑ کر یہاں لے آتا ہوں۔ ٹرائل روم میں لے جا کر اس پر تھوڑی "محنت" کریں گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے، سکندر علی!" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ "میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ تم جاؤ اور قادر بخش کو گرفتار کر کے تھانے لے آؤ۔ دیکھتے ہیں، وہ کون سی رام کہانی سناتا ہے۔" میں تھوڑی دیر کے لئے رکا، پھر اے ایس آئی سے پوچھا۔

"یہ قادر بخش کرتا کیا ہے؟"

"قادر بخش بکروال ہے۔" سکندر علی نے جواب دیا۔ "وہ دراصل بکریوں اور بھیڑوں وغیرہ کی خرید و فروخت کا کام کرتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کا سفر کرتا رہتا ہے۔ وہ کبھی یہاں ہوتا ہے تو کبھی وہاں۔ لیکن یہ ہے کہ وہ زیادہ دنوں کے لئے رائے پور سے دور نہیں رہتا۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے، ایک آدھ دن میں واپس آ جاتا ہے۔"

"لگتا ہے، تم نے اس بکروال قادر بخش پر بڑی تحقیق کر رکھی ہے۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "کیا وہ شادی شدہ ہے؟"

آخری سوال اچانک ہی میرے ذہن میں آ گیا تھا۔ سکندر علی نے جواب میں بتایا۔

"جی ملک صاحب! قادر بخش شادی شدہ ہے۔ اس کی شادی کو لگ بھگ آٹھ

سال ہو گئے ہیں، لیکن ابھی تک اس کے گھر اولاد نہیں ہوئی۔"

"دیکھنے میں کیسا نظر آتا ہے؟" میں نے سوال کیا۔ "اس کی شخصیت کیسی ہے؟"

"شخصیت بڑی متاثر کن اور جاندار ہے۔" سکندر علی نے بتایا۔ "قادر بخش کی عمر پینتیس کے قریب ہوگی۔ وہ ایک جوان اور پُرکشش مرد ہے۔"

"ہوں.....!" میں چند لمحات کے لئے گہری سوچ میں ڈوب گیا، پھر اے ایس آئی سے کہا۔ "سکندر علی! تم جاؤ اور فوراً قادر بخش کو پکڑ کر میرے پاس لے آؤ۔"

اے ایس آئی تھانے سے روانہ ہوا تو میں دوسرے انتظامات میں لگ گیا۔ اس کیس کی بساط پر دو نہایت ہی اہم مہرے اور بھی موجود تھے۔ نمبر ایک، وزیر علی۔ نمبر دو، کھوجی بابا جلال دین۔

قادر بخش کا کردار نمایاں ہونے کے بعد مجھے وزیر علی پر سخت غصہ آ رہا تھا۔ میں نے کرید کرید کر اور شرافت کی زبان میں اس سے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ مجھے مقتولہ کے حوالے سے کوئی ایسا اشارہ دے، جو اس کے قاتل تک پہنچنے میں میری مدد کر سکے، لیکن اس نے زبان پر جیسے تالا ڈال لیا تھا۔ اس نے مقتولہ کے کردار کو شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اپنے دل کا احوال اکرام اللہ سے تو کہہ ڈالا تھا، لیکن مجھ سے دانستہ چھپایا تھا۔ اگر یہ بات وزیر علی کے علم میں تھی تو ظاہر ہے ملکہ بھی اس معاملے سے بے خبر نہیں رہی ہوگی۔ ان دونوں میاں بیوی نے مجھ سے مسلسل جھوٹ بولا تھا، لہٰذا اس حرکت کے لئے ان سے باز پرس ضروری ہو گئی تھی۔

دوسری طرف جلال دین غائب تھا۔ سکندر علی کے مطابق، آج اسے تھانے آ کر کئی اہم راز کا انکشاف کرنا تھا، لیکن دوپہر ہو چلی تھی اور دُور دُور تک جلال دین کے آثار نظر نہیں آتے تھے۔ میں اُسے ایسا غیر ذمے دار نہیں سمجھتا تھا۔ پتہ نہیں، اس کے ساتھ ایسا کیا ہو گیا تھا!

میں نے کانسٹیبل افتخار کو اپنے پاس بلایا اور ضروری ہدایات دینے کے بعد کہا۔ "تم پہلے جلال دین کے گھر جاؤ اور اگر وہ گھر میں مل جائے تو اس سے کہو کہ میں نے اسے فوراً تھانے بلایا ہے۔ اس کے بعد....." میں لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "اس کے بعد تم وزیر علی کے پاس جانا اور اسے اپنے ساتھ لے کر



میرے پاس آ جانا۔"

افتخار نے حکم کی تعمیل کی یقین دہانی کرائی اور سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد حوالدار نبی جان میرے کمرے میں آ گیا اور ہم اس کیس کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ نبی جان کو ہر بات کی آگاہی تھی اور وہ کل صبح ہی سے اس کیس میں شامل تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔

"ملک صاحب! آپ نے سکندر علی کو قادر بخش کی طرف بھیجا ہے اور افتخار کو وزیر علی کی جانب..... اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ ان دونوں افراد کے گھر قریب قریب واقع ہیں۔ یہ کام کوئی بندہ بھی کر سکتا تھا؟"

"ہاں، یہ کام واقعی ایک بندہ کر سکتا تھا۔ لیکن جیسا کہ تم نے کہا، اس میں کوئی مصلحت پوشیدہ ہے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "سکندر علی اور افتخار دو مختلف اوقات میں وہاں پہنچیں گے۔ افتخار کو میں نے ہدایت کی ہے کہ وہ پہلے کھوجی کی طرف جائے، بعد ازاں وزیر علی کے گھر کا رخ کر لے۔ اس طرح ان دونوں پولیس اہلکاروں کی وہاں آمد میں لگ بھگ آدھے گھنٹے کا فرق آ جائے گا۔ جب افتخار، وزیر علی کے گھر پہنچے گا تو سکندر علی، قادر بخش کو لے کر تھانے آ چکا ہوگا۔" میں ایک لمحے کے لئے رکا، پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔

"میں ان دونوں بندوں کو الگ الگ طریقے سے "چیک" کرنا چاہتا ہوں تاکہ بہتر اور کارآمد نتائج حاصل کئے جا سکیں۔"

نبی جان اثبات میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

❁.....❁

اے ایس آئی سکندر علی، خالی ہاتھ واپس آیا تو مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ وہ میرے سامنے آ کر بیٹھا تو میں نے پوچھا۔ "کیا رہا، سکندر علی؟"

"قادر بخش گھر میں موجود نہیں ہے جناب!" اس نے جواب دیا۔

"گھر میں موجود نہیں تو پھر کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میری اس کی بیوی سے بات ہوئی ہے۔" سکندر نے بتایا۔ "فریدہ کا کہنا ہے کہ

قادر بخش، چک جیونا گیا ہوا ہے۔"

چک جیونا، قصبہ رائے پور کے جنوب میں پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اے ایس آئی سے پوچھا۔

"وہ چک جیونا کب اور کس کام سے گیا ہے؟"

"کام تو اس کا میں آپ کو بتا چکا ہوں، جناب!" اس نے جواب دیا۔ "وہ بکریوں اور بھیڑوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں وہاں گیا ہے اور فریدہ نے مجھے بتایا ہے کہ جس رات عابدہ کا قتل ہوا، اس سے پہلے والی دوپہر کو وہ گھر سے نکلا تھا۔

"اس کا مطلب ہے، قادر بخش کی روانگی کے بارہ تیرہ گھنٹے بعد عابدہ کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا ہے۔" میں نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہو گئی۔ اگر قادر بخش کی بیوی کا بیان درست ہے تو یہ بندہ شک کے دائرے سے باہر نکل جاتا ہے۔"

"جناب! فریدہ نے تو بڑے وثوق سے اس کی روانگی کے بارے میں بتایا ہے۔" سکندر علی کی آواز میں بھی اُلجھن جھلکتی تھی۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں، ملک صاحب! اگر قادر بخش نے عابدہ کی موت کے وقت، اپنی موجودگی کو جائے وقوعہ سے پانچ میل دُور ثابت کر دیا تو واقعی قاتل کی حیثیت میں اس پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں رہے گا۔" وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"اگر وہ دوپہر میں رائے پور سے روانہ ہوا تھا تو یقیناً سورج غروب ہونے سے پہلے وہ چک جیونا پہنچ گیا ہوگا اور وہ رات جب عابدہ کو موت کے گھاٹ اُتارا گیا، قادر بخش نے چک جیونا میں گزاری ہوگی۔ اس شب بسری کے ثبوت کے لئے اس کے پاس چند گواہ بھی ہوں گے، لہٰذا اسے عابدہ کا قاتل ٹھہرانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ثابت ہوگا۔"

"بعد میں جو کچھ بھی ہوگا، اس کے بارے میں بعد ہی میں سوچیں گے، سکندر علی!" میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ابھی تو وہ ہمارے ہاتھ ہی میں نہیں..... تم یہ بتاؤ کہ اس کی بیوی فریدہ نے واپسی کے بارے میں کیا کہا ہے؟ قادر بخش اپنے کاروباری دورے سے واپس کب آئے گا؟"



"فریدہ نے آج رات یا کل صبح اس کی واپسی کا امکان ظاہر کیا ہے۔" سکندر علی نے جواب دیا۔ "میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ قادر بخش جیسے ہی رائے پور میں قدم رکھے، وہ فوراً اسے تھانے بھیج دے۔"

"فریدہ نے کسی قسم کی تشویش ظاہر نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔ "کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ پولیس کو اس کے خاوند قادر بخش کی تلاش کس سلسلے میں ہے؟"

"نہیں جناب!" سکندر علی نے نفی میں گردن ہلائی۔ "میں نے اُسے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا۔"

"اس نے پوچھا بھی نہیں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"پوچھا تھا۔ اور..... بڑی تشویش سے پوچھا تھا۔" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے فریدہ سے ایک خوب صورت بہانہ کیا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "کیسا بہانہ، سکندر علی؟"

"میں نے یہ کہہ کر اس کی تسلی کر دی ہے کہ....." سکندر علی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ قادر بخش، چوری کے جانوروں کا کاروبار کرتا ہے۔ اسی سلسلے میں پوچھ گچھ کے لئے اسے تھانے بلایا جا رہا ہے۔"

"شاباش!" میں نے ستائشی نظروں سے اے ایس آئی کو دیکھا اور کہا۔ "تم نے واقعی بڑی خوب صورتی سے معاملے کو کور کیا ہے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ جب تک قادر بخش ہمارے ہتھے نہ چڑھ جائے، ہمارے مشن کو..... کم از کم اس کی بیوی کی حد تک اوپن نہیں ہونا چاہئے۔"

"دوسری طرف کی کیا خبر ہے، ملک صاحب!" سکندر علی نے مجھ سے پوچھا۔

"میرا اشارہ وزیر علی کی جانب ہے۔"

"میں نے اسے بلانے کے لئے بندے کو دوڑایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ بابے جلالے کو بھی پٹخ کرتا آئے گا۔"

"بابا جلال دین کے ذکر پر یاد آیا، ملک صاحب.....!" وہ پُرسوچ لہجے میں

بولا۔ ''اسے تو آج جائے وقوعہ کا تنقیدی جائزہ لینے کے لئے کوئی سنسنی خیز انکشاف کرنا تھا۔''

''سکندر علی! رات کی بارش کے بعد اب حالات تو ایسے نہیں رہے کہ کھرے کے کام کو مزید جاری رکھا جا سکے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجھے اس بات کی تشویش بہرحال ہے کہ جلال دین رپورٹ کرنے تھانے کیوں نہیں آیا؟''

ادھر میری بات ختم ہوئی، اُدھر کانسٹیبل افتخار نے میرے کمرے میں انٹری دی۔ میں نے کچھ دیر پہلے افتخار کو جلال دین اور وزیر علی کی طرف روانہ کیا تھا۔ افتخار مجھے سلام کرنے کے بعد اٹین شین کھڑا ہو گیا۔

میں نے پوچھا۔ ''ہاں بھئی، کیا رپورٹ ہے اُدھر کی؟''

''وزیر علی کو میں اپنے ساتھ لے آیا ہوں جناب!'' وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ باہر برآمدے میں بیٹھا ہے۔''

''اور بابا جلالا؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''کھوجی جلال دین کی حالت بہت خراب ہے جناب!'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''کیوں..... کیا ہوا ہے اس کو؟'' میں نے تیز آواز میں پوچھا۔

افتخار نے بتایا۔ ''وہ گزشتہ رات سے بخار میں پڑا ہے۔ ابھی بھی اس کا پورا بدن آگ جیسا ہو رہا ہے۔ میں خود اسے چیک کر کے آ رہا ہوں۔ حکیم جی سے دوا لی ہے۔ حکیم نے کہا ہے کہ جلال دین کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ رات تک بخار ہلکا ہو جائے گا۔''

''اب میری سمجھ میں آ گیا کہ بابا جلال دین غائب کیوں ہے؟'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، افتخار! تم وزیر علی کو اندر بھیج دو۔''

وہ ''یس سر!'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وزیر علی میرے سامنے موجود تھا۔ میں نے معتدل لہجے میں اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں نے اسے کس مقصد کے لئے بلایا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو اس کے چہرے کے تاثرات سے چھپی نہ



رہتی۔ اس نے بیٹھتے ہی مجھ سے سوال کیا۔

''تھانیدار صاحب! عابدہ کی لاش آج ہسپتال سے آ جائے گی نا؟''

''آج کا امکان تو ذرا کم ہی ہے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''البتہ کل کے بارے میں یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے۔ اور ہاں.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کل ایس پی آفس سے تمہارے بیٹے مشتاق کو فون کر دیا تھا۔ مشتاق سے میری بات تو نہیں ہو سکی۔ فون اُس کے سپروائزر نے اٹھایا تھا۔ مشتاق اس وقت فیکٹری میں موجود نہیں تھا۔ تاہم سپروزائر نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مشتاق کو نہ صرف یہ کہ اس اندوہناک واقعے سے آگاہ کر دے گا بلکہ اسے پہلی فرصت میں پاکستان بھی بھیج دے گا۔''

''بہت بہت شکریہ، تھانیدار صاحب!'' وہ نرمی سے بولا، پھر پوچھا۔ ''عابدہ کے قاتل کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ نہیں؟''

''یہی پتہ چلانے کے لئے تو تمہیں یہاں بلایا ہے، وزیر علی!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس سلسلے میں میری مدد کرو گے نا؟''

''جناب! میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ.....''

''پہلے کی بات چھوڑ دو، وزیر علی!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''اب حالات بہت مختلف شکل اختیار کر چکے ہیں۔ میں قاتل کے بہت قریب پہنچ گیا ہوں۔ تمہیں صرف تصدیق یا تردید کرنا ہے۔''

میں دراصل وزیر علی کو بے خبر رکھ کر اس پر ایک نفسیاتی حربہ آزمانا چاہتا تھا، تاکہ اس کے دل اور دماغ کا احوال واضح ہو سکے۔ میری بات سنتے ہی وہ چونکا اور اضطراری لہجے میں بولا۔

''آپ کے خیال میں عابدہ کو کس نے قتل کیا ہے؟''

''قادر بخش نے۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے۔''

بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ پھر وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

اس کے چہرے کے تاثرات سے لگتا تھا کہ جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو۔ جو کچھ اس کی زبان سے ادا ہوا تھا، وہ سب شاید اسے نہیں کہنا چاہئے تھا۔ میں نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''یعنی تمہاری نظر میں بھی قادر بخش ہی عابدہ کا قاتل ہے؟''

''وہ جی.....'' وہ صورتِ حال کو سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا مطلب یہ تھا کہ.....ایسا ہو سکتا ہے.....قادر بخش نے عابدہ کو.....ٹھکانے لگا دیا ہو۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں استفسار کیا۔ مجھے محسوس ہو گیا تھا کہ وزیر علی اس معاملے میں اندر سے بڑا کمزور ہے۔ ''قادر بخش، عابدہ کا خون کیوں کر سکتا ہے؟ تمہاری بہو سے اُس بکروال کی کیا دشمنی تھی؟ کیا عابدہ نے اس کی کوئی بھیڑ بکری چرا لی تھی یا کسی بکری کا دودھ نکال لیا تھا؟ تمہارا دھیان قادر بخش کی طرف ہی کیوں گیا؟.....اور اگر تمہیں اس بندے پر ذرا سا بھی شک تھا تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ میں نے کتنا کرید کرید کر تم سے پوچھا تھا۔''

''آپ نے.....'' وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک ہی سانس میں اتنے.....سارے سوالات کر دیئے ہیں کہ.....میرا دماغ ہل کر.....رہ گیا ہے۔ مم.....مم.....'' وہ لکنت زدہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گیا اور وحشت زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''وزیر علی! یہ ضروری نہیں ہے کہ تم میرے سوالات کے جوابات ایک ہی سانس میں دو، لیکن ایک بات ذہن میں رکھ لینا کہ اب جھوٹ کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ میں اکرام اللہ سے تفصیلی بات کر چکا ہوں، جس سے تم نے عابدہ اور قادر بخش کے حوالے سے چند شرم ناک باتیں کی تھیں۔ وہ باتیں اکرام اللہ کی بیوی سائرہ کے ذریعے راشد کی بیوی بلقیس تک اور راشد تک بھی پہنچ چکی ہیں۔ راشد تمہیں اپنی بہن عابدہ کا قاتل سمجھتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں.....''

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بات



مکمل کرتے ہوئے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''وزیر علی! میں جانتا ہوں کہ تم قاتل نہیں ہو۔ لیکن اگر تم نے کسی بھی معاملے میں اب ذرا سی بھی غلط بیانی سے کام لیا تو میں کوئی تگڑا کیس بنا کر تمہیں جیل بھجوا دوں گا۔''

وہ کرسی پر جیسے ڈھے سا گیا۔ میری دھمکی نے اسے چاروں خانے چت کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ متغیر ہو گیا، آنکھوں میں خوف کے سائے لہرانے لگے، پھنسی پھنسی آواز میں اس نے مجھ سے کہا۔

''تھانیدار صاحب! کسی بھی معاملے میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے بڑے واضح انداز میں یہ محسوس کیا تھا کہ عابدہ اور قادر بخش کے درمیان کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ وہ دونوں چھپ چھپ کر ملتے بھی ہیں۔ اس معاملے کی تصدیق کے لئے میں نے سب سے پہلے عابدہ سے پوچھا تو وہ صاف مکر گئی۔ اس سلسلے میں، میں قادر بخش سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ آپ میری نازک پوزیشن کا اندازہ لگا سکتے ہیں.....جب مجھ سے زیادہ برداشت نہیں ہوا تو میں نے اکرام اللہ کو دل کا حال سنا ڈالا۔ وہ بڑا ہی بھلا مانس اور مخلص دوست ہے۔ لیکن شاید.....مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے اسے بھی نہیں بتانا چاہئے تھا۔''

''تمہاری غلطی یہ نہیں کہ تم نے اکرام اللہ کو اپنے درد سے آشنا کر دیا تھا۔ یہ تو تمہارا ایک فطری ردِعمل تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''غلطی تم سے یہاں پر ہوئی کہ تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔''

''میں بہت شرمندہ ہوں جناب!'' وہ ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''مجھ سے بھول ہو گئی۔ آئندہ میں ایسی کوتاہی نہیں کروں گا۔ مجھے معاف کر دیں۔ وہ دراصل، میں اپنی عزت کی خاطر زبان بند رکھنے پر مجبور ہو گیا تھا۔''

میں اس کی مجبوری کو سمجھ سکتا تھا۔ اس مجبوری میں شرافت اور سادگی کا بھی غالب ہاتھ تھا۔ جب معاملہ گھر کی عزت کا ہو تو انسان مختلف مرحلوں پر خاموشی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اس نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ میرے ہم خیال ہیں اور آپ کی تفتیش کے مطابق، قادر

بخش ہی نے عابدہ کا خون کیا ہے تو پھر آپ اسے گرفتار کر کے جیل کیوں نہیں بھجوا دیتے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وزیر علی! مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری بہو کو قادر بخش نے قتل کیا ہے۔''

''جی.....'' وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ کہہ رہے تھے کہ.....''

''وہ بات میں نے تمہاری زبان کھلوانے کے لئے کہی تھی، وزیر علی!'' میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''اور واقعی، تم سچ اُگلنے پر مجبور ہو گئے۔''

''لیکن آپ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قادر بخش، قتل کی اس واردات میں ملوث نہیں؟'' وہ حیرت اور اُلجھن سے بھرپور لہجے میں بولا۔

میں نے نہایت ہی مستحکم لہجے میں کہا۔ ''وزیر علی! ویسے تو قادر بخش کے ہاتھ لگنے کے بعد ہی حقیقت حال پر سے پردہ اُٹھے گا، لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ جب عابدہ کا قتل ہوا، قادر بخش جائے وقوعہ سے پانچ میل دُور چک جیونا میں موجود تھا۔ جب وہ رائے پور میں تھا ہی نہیں تو پھر عابدہ کو قتل کیسے کر سکتا ہے؟''

''کیا آپ کو یقین ہے کہ عابدہ کے قتل کے وقت قادر بخش، رائے پور میں نہیں تھا؟'' وہ متذبذب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''میں نے بتایا ہے نا، مجھے کہیں سے اس بات کا پتہ چلا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تصدیق تو اس وقت ہو سکے گی، جب قادر بخش واپس رائے پور آئے گا۔ اُس کی بیوی فریدہ نے بتایا ہے کہ وہ آج شام کو یا کل کسی وقت چک جیونا سے واپس آ جائے گا۔''

''وہ یہاں سے گیا کب تھا؟'' وزیر علی نے تشکیک آمیز لہجے میں پوچھا۔

میں نے جواب دیا۔

''وہ عابدہ کی موت سے نو، دس گھنٹے پہلے اپنی بھیڑ بکریوں کے ہمراہ رائے پور سے روانہ ہو گیا تھا۔ فریدہ نے اس کی روانگی کے وقت کی تصدیق کی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے وزیر علی سے پوچھا۔ ''قادر بخش اور فریدہ تم



سے صرف تین گھر کے فاصلے پر رہتے ہیں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی کہ تم ان کے معمولات سے اتنے بے خبر کیوں ہو، جبکہ..... تم قادر بخش اور عابدہ کے درمیان چلنے والے چکر سے بھی اچھی طرح واقف ہو؟''

''دراصل، اس بے خبری کی وجہ یہ واقفیت ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب سے مجھے قادر بخش کے کرتوتوں کا پتہ چلا تھا، مجھے اس سے شدید نفرت ہو گئی تھی۔ میں نے اس پر دھیان دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔''

''جب کہ عابدہ کے تعلق کے باعث تمہیں سب سے زیادہ دھیان اسی پر دینا چاہئے تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارے گھر کی عزت کا معاملہ تھا۔ مشتاق تمہارے ہی بھروسے پر اپنی بیوی اور بچی کو چھوڑ کر پردیس کی صعوبتیں اُٹھا رہا ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، تھانیدار صاحب!'' وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں غلط تھا۔ عابدہ کے معاملے میں مجھ سے بڑی کوتاہی ہوئی۔ اگر میں شروع میں کوئی بہادرانہ اقدام اُٹھا لیتا تو آج یہ دن دیکھنے کو نہ ملتا۔''

''وقت گزر جانے کے بعد پچھتانے یا نادم ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا، وزیر علی!'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''اب دعا کرو کہ میں جلد از جلد عابدہ کے قاتل تک پہنچ جاؤں تاکہ اسے عبرت ناک سزا دلوائی جا سکے۔''

''عابدہ کے قاتل کو اگر پھانسی لگ جاتی ہے، تو اس سے مشتاق اور فاخرہ کے نقصان کی تلافی نہیں ہو سکے گی۔'' وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''مشتاق کی بیوی اور فاخرہ کی ماں کو اب کوئی بھی واپس نہیں لا سکتا۔''

اس کی دلی شکستگی اور افسردگی کو میں بڑی اچھی طرح محسوس کر رہا تھا، لیکن سچی بات یہ تھی کہ میں اس بگاڑ کو سدھار سکتا تھا اور نہ ہی اس خلا کو پُر کر سکتا تھا، جو عابدہ کی موت سے ان لڑکوں کی زندگیوں میں پیدا ہو چکا تھا۔ قدرت کی مصلحتوں کے سامنے گردن جھکانا ہی پڑتی ہے!

❁.....❁

حکیم جی کا کہنا تھا کہ جلال دین کا بخار، رات تک ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن مجھے ایسے

کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ اس کا بدن تنور کے مانند دہک رہا تھا۔

میں اے ایس آئی کے ساتھ اسے دیکھنے اس کے گھر پہنچ گیا تھا اور اس وقت جلال دین کے پاس ہی بیٹھا ہوا تھا۔ ایک اچھی بات یہ ہوئی تھی، یا یوں کہیں کہ حکیم جی کی دوا نے اتنا اثر ضرور دکھایا تھا کہ بابا جلالا اب ہوش و حواس میں تھا اور بات کرنے کے قابل بھی تھا۔

اس نے مجھے دیکھتے ہی بے حد معذرت کی اور اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ لیکن میں نے اسے دوبارہ بستر پر لٹا دیا اور تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

''کسی معذرت کی ضرورت نہیں ہے، جلال دین! تم اس قابل ہی نہیں رہے تھے کہ تھانے آ سکتے۔ اور جہاں تک کھرا نکالنے کا تعلق ہے تو..... گزشتہ رات ہونے والی بارش نے اس کہانی کو ہی ختم کر دیا ہے۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، ملک صاحب!'' وہ نقاہت آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''جو کہانی اختتام پذیر ہو گئی، اس کے آخر کے چند تحیر آمیز واقعات میرے علم میں نہیں آ سکے..... وہ واقعات میں تمہاری زبانی سنوں گا۔''

وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں بڑی معنی خیزی تھی۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جلال دین! گزشتہ روز تم نے جو کھرا اُٹھایا، اس کے نتائج کے بعض حصوں نے تمہیں اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔ تم کسی خاص حوالے سے متذبذب تھے اور کسی حتمی رائے تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ مجھے بتاؤ، ایسی کیا بات تھی؟''

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے کہنا شروع کیا۔

''ملک صاحب! میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے اور میرے پیشہ ورانہ تجربہ اور مہارت کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیری والے کھوہ کے پاس مقتولہ عابدہ کسی جاندار عورت سے نبرد آزما رہی تھی۔''

''کسی عورت سے.....؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ کمزور سی آواز میں بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں، ملک صاحب! اور اسی نکتے نے مجھے اُلجھا کر رکھا ہوا ہے۔ جائے واردات پر جہاں مقتولہ کی ٹوٹی ہوئی



چوڑیوں کے ٹکڑے اور دیگر اشیاء پڑی ملی ہیں، وہاں دو افراد کا کھرا بڑا واضح نظر آیا ہے۔ پاؤں کے ان نشانات سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دونوں افراد ایک دوسرے سے اُلجھ رہے ہیں اور میری ماہرانہ آنکھیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہیں کہ وہ دونوں افراد سو فیصد عورتیں تھیں۔ عورتوں کے پاؤں کے مخصوص دباؤ کے باعث ان کا کھرا مردوں کی بہ نسبت بہت مختلف ہوتا ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ ان میں سے ایک کھرا تو مقتولہ عابدہ کا تھا اور دوسرا کسی صحت مند اور توانا عورت کا۔''

وہ لمحے بھر کو خاموش ہوا، دو چار گہری گہری سانسیں لیں اور سلسلۂ گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میں نے وزیر علی کے گھر سے لے کر جائے وقوعہ تک کے راستے کو اچھی طرح کھنگالا تھا۔ اس راہ میں مجھے مقتولہ کے قدموں کے نشانات ملے تھے لیکن میں نے جس طاقت ور عورت کا ابھی ذکر کیا ہے، اس کا کھرا وہاں کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ جس کا مطلب ہے کہ وہ کسی اور راستے سے بیری والے کھوہ تک پہنچی تھی۔''

''جلال دین!'' اس کے بیان میں ایک مرتبہ پھر توقف آیا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات تم کس بنا پر کہہ رہے ہو کہ دوسری عورت بڑی جاندار، طاقت ور اور صحت مند و توانا تھی؟''

''اس کے پاؤں کے غیر معمولی سائز اور مخصوص دباؤ کے باعث۔'' جلال دین نے ایک بوجھل سانس چھوڑتے ہوئے بتایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ عورت ہاتھ پاؤں کی مضبوط ہو گی۔ یہ کھرے کی بعض تکنیکی نزاکتیں ہیں، جو میں وضاحت سے نہیں سمجھا سکتا، ملک صاحب!''

''فی الحال، ایسی کسی وضاحت کی ضرورت ہے اور نہ ہی تمہاری صحت اجازت دیتی ہے، جلال دین!'' میں نے موقع محل کی نزاکت کے پیشِ نظر کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ اس صحت مند عورت کے کھرے نے اور کیا کیا راز اُگلے ہیں؟''

اس دوران اے ایس آئی سکندر علی دم سادھے بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جلال دین کے انکشافات نے اسے کسی گہری سوچ میں غرق کر دیا تھا۔ کھوجی بابا نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''میں نے تھوڑی کوشش اور محنت کے بعد اس عورت کا کھرا بھی پکڑ لیا تھا۔ وہ کھیتوں کے اندر سے ہوتے ہوئے جائے وقوعہ تک پہنچی تھی اور پھر اسی راستے سے واپس بھی گئی تھی۔''

''لیکن وہ کہاں سے چل کر جائے وقوعہ تک پہنچی تھی؟'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ ''اور واپس وہ کہاں گئی؟''

''وہ جہاں سے آئی تھی، واپس وہیں پہنچی تھی۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے کھرے کا تعاقب کرتے ہوئے ایک ایسے گھر تک پہنچا تھا، جو مقتولہ کے گھر سے صرف تین مکان کے فاصلے پر واقع ہے۔''

''تم قادر بخش کے گھر کی بات کر رہے ہو، جلال دین؟'' میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔

اسی لمحے سکندر علی کی جوشیلی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ملک صاحب! میں نے قادر بخش کی بیوی فریدہ کو بڑی باریک بینی سے دیکھا ہے۔ وہ بابے جلالے کے بتائے ہوئے قد بت پر سولہ آنے پوری اُترتی ہے۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں، صحت مند اور توانا جسم۔''

''میں بھی کل اسی نتیجے پر پہنچا تھا، ملک صاحب!'' جلال دین نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''اور اسی بات نے مجھے اُلجھا دیا تھا اور میں چاہتا تھا کہ آپ کی خدمت میں کوئی حتمی رپورٹ پیش کرنے سے پہلے میں ایک مرتبہ پھر کھرے کا جائزہ لے لوں۔ لیکن بارش نے سب کچھ ختم کر دیا۔''

جلال دین نے متوقع قاتل عورت کی آمد و شد کا جو رُوٹ بتایا تھا، وہ کھیتوں کا وہی حصہ تھا، جہاں سے حوالدار نبی جان کو وہ رسّی ملی تھی، جس کے بارے میں میرا خیال یہ تھا کہ عابدہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لئے اسی رسّی سے اس کے گلے میں پھندا ڈالا گیا تھا۔

''جلال دین! گزشتہ رات والی بارش کی شرارت پر افسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت چھپی ہوتی ہے۔ ویسے تم نے اتنی کارگزاری دکھا دی ہے کہ میں با آسانی



قاتل تک پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے لمحے بھر کو رک کر ایک اطمینان بھری سانس خارج کی اور کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''جلال دین! تم مکمل آرام کرو۔ ذہن کو تھکانے کی ضرورت نہیں۔ میرا کام ہو گیا ہے۔''

وہ تشکر آمیز، فخریہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

جلال دین اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتا تھا، جن کے چار بچے بھی تھے۔ میں نے اس کے بیٹے کو خصوصی ہدایت کی کہ وہ اپنے باپ کا بہت زیادہ خیال رکھے۔ پھر میں سکندر علی کے ساتھ اس کے گھر سے نکل آیا۔

❁.....❁

پولیس کو کسی مجرم کے بارے میں کوئی حتمی اشارہ مل جائے تو پھر وہ پلک جھپکتے میں منزل پر پہنچ کر اپنا مقصد حاصل کر لیتی ہے۔ میرے ساتھ بھی اس کیس میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ جلال دین کی ''راہ نمائی'' کو مشعل راہ جان کر میں نے پہلی فرصت میں قادر بخش کی بیوی فریدہ کو تھانے بلوا کر اس کا ٹرائل شروع کر دیا۔

فریدہ کوئی عادی مجرم نہیں تھی اور نہ ہی اس کا پھولن دیوی ایسا دل گردہ تھا، لہٰذا اس نے ایک آدھ تفتیشی فارمولے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ اس نے یہ قتل اپنے گھر اور گھر والے کو بچانے کے لئے کیا تھا۔ جبھی اس نے واردات کے لئے ایک ایسی رات کا انتخاب کیا، جب قادر بخش گھر پر موجود نہ ہوتا کہ اس قتل کے حوالے سے اس پر کسی کا شک نہ جائے۔

اقبالِ جرم کرتے ہوئے فریدہ نے مجھے بتایا کہ وہ قادر بخش اور عابدہ کے چکر سے واقف ہو گئی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں جب اس نے اپنے شوہر سے بات کی تو وہ صاف مکر گیا۔ لیکن وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ قادر بخش اور عابدہ چھپ چھپ کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اس نے کوشش کر کے یہ پتہ بھی لگا لیا کہ وہ اندھیری رات کا فائدہ اُٹھا کر بیری والے کھوہ پر ملاقات کرتے ہیں۔

جب اسے شوہر ہاتھ سے نکلتا ہوا اور گھر برباد ہوتا دکھائی دیا تو اس نے ایک انتہائی قدم اُٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ شادی کو آٹھ سال گزر جانے کے باوجود بھی اس کی

گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے اس کی پوزیشن خاصی کمزور اور نازک تھی۔ قادر بخش کو اپنے ساتھ باندھ کر رکھنے کے لئے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا، لہٰذا اس نے اپنی راہ کے کانٹے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صاف کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور وقوعہ کی رات اپنے ارادے کو پورا بھی کر دکھایا۔

میں نے اس کا مکمل بیان لینے کے بعد پوچھا۔

''فریدہ! تم نے جو کچھ کہا، وہ تو سمجھ میں آ رہا ہے۔ لیکن چند باتیں ہنوز میرے ذہن کو اُلجھا رہی ہیں۔''

وہ منہ سے ایک لفظ ادا کئے بغیر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک ایسی رات کا انتخاب کیا، جب تمہارا خاوند گھر سے اور جائے واردات سے پانچ میل دُور چک جیونا میں موجود تھا۔ تاکہ قادر بخش کی ذات شک کے دائرے میں نہ آ سکے۔ لیکن یہ بتاؤ، جب قادر بخش، رائے پور میں موجود ہی نہیں تھا تو عابدہ اس سے ملاقات کے لئے بیری والے کھوہ پر کیوں گئی؟''

''اسے ایسا کرنے کے لئے میں نے مجبور کیا تھا۔'' فریدہ سپاٹ آواز میں بولی۔

''تم نے مجبور کیا تھا؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر کیسے؟''

''میں ان کی ملاقات کے طریق کار سے واقف ہو گئی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگی۔ ''انہوں نے آپس میں مشورہ کر کے چند اشارے طے کر لئے تھے۔ جب انہیں ملنا ہوتا تھا تو قادر بخش، عابدہ کی بچی فاخرہ کے ہاتھ پر پین کی مدد سے ایک مخصوص نشان بنا دیا کرتا تھا، جو کسی ستارے سے مشابہ ہوتا۔ عابدہ، فاخرہ کا ہاتھ دیکھ کر سمجھ جاتی کہ آج رات جب پورا قصبہ گہری نیند کے مزے لوٹ رہا ہو تو اسے قادر بخش سے ملنے کے لئے بیری والے کھوہ پر جانا ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتی تھی۔ میں نے بھی اسی طریقے کو اپنا کر عابدہ کو بیری والے کھوہ تک بلا لیا تھا، جہاں ایک درخت کی اوٹ میں، میں پہلے سے چھپی کھڑی تھی۔ پھر رسّی نے میرا کام آسان کر دیا۔ وہ میری ''گرفت'' میں بہت تڑپی، پھڑکی لیکن میں نے رسّی کے پھندے میں ذرا سی کمزوری نہیں آنے دی اور جب تک وہ اس دنیا سے اُس دنیا میں نہیں پہنچ گئی، میں



نے رسّی کو کس کر تھامے رکھا۔'' وہ لمحہ بھر کو متوقف ہوئی، ایک آسودہ سانس خارج کی اور بڑی سفاکی سے بولی۔

''میں نے عابدہ کی لاش کو بیری والے کھوہ کے پاس چھوڑا، رسّی کو کھیتوں کی طرف اُچھال دیا اور اطمینان سے چلتے ہوئے گھر آ گئی۔ مجھے پکا یقین تھا کہ میری یہ ''حرکت'' کسی کی نظر میں نہیں آئے گی۔ لیکن اُس مردود کھوجی نے میری ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔''

بات کے اختتام پر فریدہ کے چہرے اور آنکھوں میں کچھ اس قسم کے تاثرات اُبھر آئے تھے، جیسے اس نے کسی نہایت ہی تلخ شے کو بے خیالی میں دانتوں تلے دبا لیا ہو۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا عابدہ کو یہ بات پتہ نہیں تھی کہ قادر بخش دوپہر ہی کو گاؤں سے نکل گیا تھا؟''

''میرا خیال ہے، وہ قادر بخش کی روانگی سے واقف نہیں تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اگر اسے پتہ ہوتا کہ قادر بخش، چک جیونا گیا ہوا ہے تو وہ کبھی بیری والے کھوہ کا رخ نہ کرتی۔''

''لیکن تمہاری یہ چال بہت ہی خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر عابدہ کو قادر بخش نے اپنے پروگرام سے آگاہ کر رکھا ہوتا تو پلک جھپکتے میں تمہاری چوری پکڑی جا سکتی تھی، یعنی تمہاری یہ اندھی چال بری طرح ناکامیاب ہو جاتی۔''

''میں جانتی ہوں، تھانیدار صاحب!..... اور یہ نکتہ میرے ذہن میں بھی تھا۔'' وہ ایک افسردہ سی سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''لیکن کہیں نہ کہیں تو کسی کمزوری کو بھی ساتھ رکھ کر چلنا پڑتا ہے۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میری کمزوری، عابدہ کی نظروں سے نہیں گزری۔''

''اور یہ تمہاری بدقسمتی تھی کہ تمہارا کھرا کھوجی کی نظر سے چپک کر رہ گیا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور یہی تمہاری گرفتاری اور تباہی کا سبب بنا۔''

جلال دین کے ذکر پر فریدہ نے ایک مرتبہ پھر برا سا منہ بنایا اور دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑتے ہوئے حوالات میں بند کر دیا۔

اگلے روز سرکاری ہسپتال سے عابدہ کی پوسٹ مارٹم شدہ لاش تھانے پہنچ گئی۔ اسی روز دوپہر کے وقت قادر بخش بھی چک جیونا سے واپس آ گیا۔ یہ کیسا سماں ہوگا، اس کے بارے میں، میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ آپ اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کے مطابق خود ہی اندازہ لگانے کی کوشش کریں۔ میں تو ان لمحات میں صرف اور صرف مشتاق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ مشتاق..... جو اپنی بیوی بچوں کی خوشحالی اور ان کے تابناک مستقبل کی خاطر رات دن پردیس کی سختیاں برداشت کرتا رہا اور اس کی بیوی یہاں برائی کی راہ پر گامزن تھی۔ اس کا شوہر تین سال سے اس کے پاس نہیں تھا، لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ وہ اپنے بے لگام جذبات کی تسکین کے لئے ایک کمزور بیساکھی کا سہارا لے لے..... یہ احسان فراموشی اور کم ظرفی کی بڑی افسوس ناک مثال تھی۔

جو لوگ زندگی کی شاہراہ پر، اپنی ٹانگیں سلامت ہونے کے باوجود بھی کسی بیساکھی کے سہارے دوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، ایک دن انہیں عابدہ کی طرح منہ کے بل زمین پر گرنا پڑتا ہے!

❁.....❁



# سیدھی چال

فروری کے ابتدائی ایام تھے۔ سردی کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ موسم بڑا خوش گوار اور فرحت بخش ہو رہا تھا۔ ایسی ہی ایک صبح میں ناشتے سے فارغ ہو کر تھانے جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ میں اپنے کوارٹر کے اکلوتے کمرے سے باہر نکلا اور دروازے کی طرف قدم بڑھا دیئے۔

اس وقت عموماً کوئی نہیں آیا کرتا تھا۔ تھانے میں اگر میری ضرورت پیش آ جاتی تو وہ لوگ دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے میرا انتظار کرتے تھے۔ کیونکہ چند منٹ بعد مجھے تھانے کے اندر پہنچنا ہی ہوتا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی، یا پھر.....''

اسی لمحے ایک مرتبہ پھر دستک کی آواز اُبھری۔ یہ اور اس سے پہلے ہونے والی دستک میں ایک خاص نوعیت کی احتیاط اور نزاکت پائی جاتی تھی، جیسے دروازہ بجانے والا ہاتھ کسی مرد کا نہیں بلکہ کسی نازک اندام حسینہ کا ہو!

''کوئی حسینہ صبح ہی صبح میرا دروازہ کھٹکھٹانے کیوں چلی گئی؟'' میں زیرِلب بڑبڑاتے ہوئے، صحن عبور کر کے بیرونی دروازے پر پہنچا اور اس سے پہلے کہ وہاں تیسری دستک کی آواز اُبھرتی، میں نے کنڈی گرا کر دروازہ کھول دیا۔

کھلے ہوئے دروازے نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی اور تصدیق بھی ڈبل.... وہاں ایک نہیں، بلکہ دو حسینائیں کھڑی تھیں۔ میں نے سوالیہ نظروں سے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا اور قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

"کیا بات ہے؟.....تم دونوں کون ہو؟ اور یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

انہوں نے بیک وقت دائیں بائیں دیکھا، جیسے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ انہیں وہاں کسی نے دیکھا تو نہیں۔ پھر ان میں سے ایک نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"تھانیدار جی! ہم آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنے آئے ہیں۔ ہمیں اندر آنے دیں۔"

میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے سرتاپا ان کا جائزہ لیا، پھر لمحاتی سوچ بچار کے بعد ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے.....آجاؤ۔"

وہ دونوں میرے کوارٹر میں داخل ہوگئیں۔ میں نے بیرونی دروازہ بھیڑ دیا اور انہیں اپنے پیچھے چلاتے ہوئے کمرے میں لے آیا۔ میں خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور انہیں چارپائی پر بیٹھنے کو کہا۔

انہوں نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

وہ دونوں تقریباً ہم عمر نظر آتی تھیں، لیکن قد و قامت اور جسامت میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ ان میں سے ایک دراز قامت اور گندمی رنگت کی تھی، جبکہ دوسری پستہ قامت اور گوری چٹی تھی۔ یہ لڑکی حُسن و جمال میں بھی دوسری، دراز قد لڑکی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میں نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"ہاں بتاؤ، آپ لوگ مجھ سے کون سی ضروری بات کرنے آئی ہوئی؟.....اور اُدھر تھانے میں آنے کے بجائے میرے کوارٹر کا رُخ کیوں کیا؟ لیکن ان سوالات کا جواب دینے سے پہلے اپنا تعارف بھی کرا دو۔"

"تھانے دار جی!" دراز قامت نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا نام جمیلہ ہے اور یہ نبیلہ ہے۔" اس نے اپنی ساتھی لڑکی کی جانب اشارہ کیا اور مزید بتایا۔ "ہم دونوں اسی قصبے کی رہنے والی ہیں۔ اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ ہم تھانے کے بجائے اِدھر کیوں آئی ہیں تو....." وہ سانس لینے کے لئے متوقف ہوئی،



پھر اضافہ کرتے ہوئے بولی۔

"دراصل بات یہ ہے کہ ہم چھپ چھپا کر یہاں آئی ہیں۔ ہم نہیں چاہتیں کہ کسی کو ہمارے یہاں آنے کا پتہ چلے۔ اگر ہم تھانے میں آتیں تو آپ کے عملے کو خبر ہو جاتی۔"

"اچھا.....!" میں نے گھور کر جمیلہ کی طرف دیکھا۔ "تم لوگ چھپ چھپا کر مجھ سے ملنے آئی ہو، اس کا مطلب ہے، کوئی بہت ہی سنگین مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟"

اب تک صرف جمیلہ ہی نے مجھ سے بات کی تھی۔ گوری چٹی نبیلہ اس کے پہلو میں خاموش بیٹھی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق، ان کی عمریں بیس اور پچیس کے درمیان تھیں۔ بعد میں مجھے پتہ چلا کہ نبیلہ تیئس سال کی اور جمیلہ پچیس سال کی تھی۔ اس مرتبہ بھی جمیلہ ہی نے میرے سوال کا جواب دیا، بلکہ یہ جواب سوال نما تھا۔

"تھانے دار جی! مسئلہ واقعی سنگین ہے۔ اور آپ وعدہ کریں کہ اس سلسلے میں ہماری...میرا مطلب ہے، نبیلہ کی مدد ضرور کریں گے۔"

"مسئلہ سنے بغیر میں تم لوگوں سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "اور یہ بھی بتاؤ کہ تم دونوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ تم بہنیں تو نہیں ہو سکتی ہو!"

"ہم دونوں بڑی گہری سہیلیاں ہیں۔" جمیلہ نے بتایا۔ "اسی دوستی کی وجہ سے نبیلہ کا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا، جو میں اسے لے کر آپ کے پاس آ گئی ہوں۔ صرف ایک آپ ہی ہیں، جو ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میں نے سنا ہے، آپ بہت ہی ایماندار اور اصول پرست تھانے دار ہیں۔ غلط بات کوئی امیر، وزیر یا چوہدری بھی کر رہا ہو، آپ اس کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے اور نہ ہی اس سے دب کر، ناانصافی کرتے ہیں۔ آپ اپنے فرائض میں کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔"

"تم نے میرے بارے میں جو کچھ بھی سنا ہے، وہ غلط نہیں۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تمہید خاصی طویل ہوگئی ہے۔ اب تم نبیلہ کے مسئلے کی طرف.....بلکہ نبیلہ! تم خود اپنا مسئلہ مجھے بتاؤ؟"

نبیلہ نے اپنی خوب صورت آنکھوں سے مجھے دیکھا اور ایک لمحے کے توقف سے

مستفسر ہوئی۔ ''تھانے دار جی! کیا بیٹیاں، بھیڑ بکریاں ہوتی ہیں؟''

''نہیں۔'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سوال کے الفاظ میں دُکھ ہی دُکھ بھرا ہوا تھا۔ ''یہ بات تم سے کس نے کہہ دی؟ بیٹیاں تو اللہ کی رحمت اور اپنے ماں باپ کی آنکھوں کا نور ہوتی ہیں۔ انہیں نہ تو بوجھ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی بھیڑ بکریاں۔''

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''لیکن مجھے تو ایسا ہی سمجھا جا رہا ہے۔''

اس کی گلوگیری کو دیکھتے ہوئے میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''نبیلہ! لگتا ہے، تمہارے گھر میں کوئی گڑبڑ چل رہی ہے، خصوصاً تمہارے رشتے یا شادی کے حوالے سے؟''

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا اور اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کو یہ بات کس نے بتائی؟''

''تمہاری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں اور رندھی ہوئی آواز نے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بیٹی! مجھے تھانے داری کرتے ہوئے کئی سال ہو گئے ہیں۔ جس طرح تم اپنے ہاتھوں اور ان کی اُنگلیوں کو پہچانتی ہو، بالکل ویسے ہی میں اپنے پاس آنے والے لوگوں اور ان کے مسائل سے واقف ہو جاتا ہوں۔'' میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''نبیلہ بیٹی! تمہاری ذہنی کیفیت اور جسمانی حالت کو دیکھتے ہوئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تمہارے والدین زبردستی تمہاری شادی کسی ایسے شخص سے کرنا چاہتے ہیں، جو تمہیں ذرا بھی پسند نہیں۔ اور یہ کہ..... تم کسی اور کو پسند کرتی ہو۔ ہے نا؟''

نبیلہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ میرے استفسار کے جواب میں کچھ کہتی، جمیلہ جلدی سے بول اٹھی۔ اس کے لہجے میں دنیا جہان کی حیرت سمٹ آئی تھی۔

''تھانیدار جی! کیا یہ کہانی ہم سے پہلے ہی آپ کے پاس پہنچ چکی ہے؟''

''نہیں!'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''پہلے تم دونوں یہاں پہنچی ہو، پھر یہ کہانی۔



میں نے بتایا ہے نا، میں نے اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر نبیلہ کے بارے میں ایک اندازہ قائم کیا ہے اور مجھے قوی امید ہے، یہ اندازہ غلط نہیں ہو سکتا۔''

''آپ یا تو غیب داں ہیں..... یا پھر کوئی نجومی۔'' جمیلہ نے حیرت آمیز نظروں سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے گناہ گار نہ کرو، بیٹی!'' میں نے تنبیہی انداز میں اُنگلی ہلاتے ہوئے جمیلہ سے کہا۔ ''غیب داں صرف خدا کی ذات ہے اور علم نجوم سے بھی میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ سب میرے پیشہ ورانہ تجربے کا نچوڑ ہے۔ اگر میں نے کچھ بھی غلط کہا ہے تو تم اس کی تردید کر سکتی ہو۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک بتایا ہے، تھانیدار جی!'' نبیلہ عقیدت بھری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''تم لوگوں کی آمد سے قبل میں تھانے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ وہاں میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔ تم نے جو کچھ بھی کہنا ہے، مختصر اور مؤثر الفاظ میں کہہ ڈالو۔ ورنہ اُدھر سے اگر مجھے کوئی بلانے آ گیا تو تمہاری، میرے پاس موجودگی کا راز کھل جائے گا اور..... تم لوگ ایسا نہیں چاہو گی۔''

نبیلہ نے سہمی ہوئی نظروں سے جمیلہ کی طرف دیکھا اور اضطراری لہجے میں بولی۔

''جمیلہ! تم ہی جلدی جلدی تھانیدار جی کو سب کچھ بتا دو۔ میں ٹھیک طرح بات نہیں کر سکوں گی۔''

نبیلہ کا اشارہ پا کر جمیلہ شروع ہو گئی۔

آئندہ دس منٹ کی گفت و شنید میں نبیلہ کے جو تازہ ترین حالات مجھ تک پہنچے، میں ان کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تاکہ آگے بڑھنے سے پہلے آپ بھی نبیلہ کے پس منظر سے آگاہ ہو جائیں۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بتایا ہے، نبیلہ نہایت ہی حسین و جمیل اور پُرکشش لڑکی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے لئے بعض اوقات اُن کا حُسن ہی سب سے بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔ بے چاری نبیلہ کے ساتھ بھی کچھ اسی نوعیت کی صورتِ حال تھی۔ وہ گاؤں ہی کے ایک نوجوان انور علی کو پسند کرتی تھی اور ظاہر ہے، اس سے شادی بھی

کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی ماں عائشہ بی بی کو اس کے جذبات، احساسات اور پسند کی ذرا پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے زبردستی اس کی شادی چوہدری مشتاق سے کرنا چاہتی تھی۔ نبیلہ کے مطابق، چوہدری مشتاق ایک عیاش شخص تھا اور عمر میں اس کے باپ سے بھی دس سال بڑا تھا۔ ''شادی'' کا لفظ تو وہ اس کی ماں کو تسلی دینے کے لئے استعمال کر رہا تھا، ورنہ اس کی نظروں میں نبیلہ کی حیثیت کسی خوب صورت کھلونے سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ چند روز تک اس دلکش کھلونے سے اپنا دل بہلاتا اور پھر اسے بھی پھینک دیتا۔ وہ ایک شادی شدہ اور پوتوں، پوتیوں، نواسوں، نواسیوں والا شخص تھا۔ اس عمر اور حالات میں وہ نبیلہ سے باقاعدہ شادی کر کے حویلی میں اپنے لئے کوئی نئی مصیبت کھڑی کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ نبیلہ اور جمیلہ کو یقین تھا کہ اگر چوہدری مشتاق نے عائشہ بی بی سے ایسی کوئی بات کی تھی تو یہ دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور..... عائشہ بڑی خوب صورتی سے یہ دھوکا کھا رہی تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ چوہدری مشتاق واقعی اس کی بیٹی کو چوہدرائن بنائے گا۔ اس طرح وہ خود چوہدری کی ساس بن جائے گی، پھر پورے گاؤں میں اس کی ٹور نکل آئے گی۔ نبیلہ یہ چاہتی تھی کہ میں اس کی ماں کو سمجھاؤں، تاکہ وہ چوہدری مشتاق کا خیال اپنے ذہن سے نکال دے۔ اسی مقصد سے وہ دونوں میرے پاس آئی تھیں۔ ان کی نظر میں ایک میں ہی تھا، جو اس مسئلے کو حل کر سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں کچھ بھی کروں، عائشہ بی بی کو سمجھاؤں یا چوہدری سے بات کروں، نتیجہ یہ نکلنا چاہئے کہ نبیلہ، چوہدری مشتاق کے ہتھے چڑھنے سے بچ جائے!

میں نے پوری توجہ سے یہ قصہ سنا اور جمیلہ کے خاموش ہونے پر نبیلہ سے پوچھا۔

''نبیلہ بیٹی! کیا تمہارا باپ حیات ہے؟''

''جی ہاں.....'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میرے ابو کا نام حیات ہی ہے۔''

''میں نے تمہارے باپ کا نام نہیں پوچھا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تمہارا باپ زندہ ہے؟''

''جی، میرے ابو زندہ ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔



''کیا تمہارے باپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ تمہاری ماں، تمہارے ساتھ کیا کرنے والی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو کو سب پتہ ہے جی۔'' وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

''تو کیا تمہارا باپ بھی اس سازش میں اپنی بیوی کا حامی ہے؟''

''نن.....نہیں جی۔'' اس نے بڑی سرعت سے نفی میں گردن ہلائی۔

''پھر.....؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ جی.....'' وہ متذبذب انداز میں بولی۔ ''گھر میں صرف امی کی چلتی ہے۔''

جمیلہ نے اپنی دانست میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تھانیدار جی! بات دراصل یہ ہے کہ نبیلہ کی امی بڑی جلال والی اور من مانی کرنے والی عورت ہے۔ حیات چاچا کی تو اس کے سامنے ذرا نہیں چلتی۔ گھر میں، ایک طرف کسی کونے میں خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ کچھ عورتوں کا تو یہ خیال ہے کہ.....!''

وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئی تو میں نے دریافت کیا۔ ''ہاں بتاؤ، بعض عورتوں کا حیات کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''وہ جی.....وہ کہتی ہیں، عائشہ نے اپنے خاوند کو اُلّو کا گوشت کھلایا ہوا ہے۔'' جمیلہ نے بتایا۔ ''اسی لئے چاچا حیات، اُلّو بنا ایک طرف پڑا رہتا ہے اور بیوی کے سامنے زبان کھولنے کی ہمت نہیں کرتا۔''

اُلّو کے گوشت اور خون کے حوالے سے متعدد داستانیں سالہا سال سے چلی آ رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے، ان میں کچھ سچائی بھی ہو، لیکن اس سلسلے میں چونکہ میرا کوئی ذاتی تجربہ نہیں ہے، اس لئے کوئی حتمی رائے پیش کرنے سے قاصر ہوں۔ سنا ہے، اُلّو کا خون اور گوشت مختلف قسم کے سفلی عملیات میں استعمال ہوتا ہے!

''ہوں.....!'' میں نے جمیلہ کی وضاحت کے جواب میں ایک گہری سانس خارج کی اور نبیلہ سے پوچھا۔ ''تمہارے اور بہن بھائی بھی ہوں گے؟''

''صرف ایک چھوٹا بھائی ہے جی۔'' وہ شکستہ لہجے میں بولی۔ ''اس کا نام یعقوب ہے، جس کی عمر پندرہ سال کے قریب ہو گی۔''

''پندرہ سال کوئی عمر نہیں ہوتی، نبیلہ!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس عمر میں لڑکا بھرپور جوان ہو جاتا ہے۔ اور بھائی تو ہمیشہ سے بہنوں کے حامی رہتے ہیں۔ کیا یعقوب کو تمہارا کوئی خیال نہیں؟ اسے تمہارے حالات کی خبر تو ہے نا؟''

''جسے خود اپنی خبر نہ ہو، وہ دوسروں کی کیا خبر رکھے گا؟'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اپنی خبر نہ ہو..... کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

اُس کی آواز ایسی بھرّائی تھی کہ میرے سوال کے جواب میں کچھ نہ بتا سکی۔ اس نازک مرحلے پر اس کی دوست جمیلہ مدد کو لپکی اور اس نے مجھے بتایا۔

''تھانیدار جی! یعقوب مستانہ ہے..... اللہ لوک ہے..... آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بالکل سمجھ رہا ہوں، بیٹی!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ نبیلہ کے نامساعد بلکہ افسوس ناک حالات سن کر میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات اُبھر آئے تھے اور میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے اس مصیبت سے ضرور نکالوں گا۔ لہٰذا میں نے اسی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''نبیلہ بیٹی! تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ اور آئندہ کے لئے چھپ چھپا کر تھانے یا میرے کوارٹر میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہارا مسئلہ بڑی توجہ سے سن اور سمجھ لیا ہے۔ میں اپنے طور پر تھوڑی تفتیش کروں گا۔ اگر تمہارے بیان کردہ حالات میں صداقت نظر آئی تو یہ میرا تم سے وعدہ ہے کہ عائشہ بی بی تمہاری مرضی کے خلاف زبردستی کہیں بھی تمہاری شادی نہیں کر سکے گی۔ اس سلسلے میں تم بالکل مطمئن ہو جاؤ۔''

''بہت بہت شکریہ، تھانیدار جی!'' وہ تشکرانہ لہجے میں بولی۔ ''اور آپ پورا بھروسا رکھیں کہ میں نے ایک ذرا سا بھی جھوٹ نہیں بولا۔''

''بڑی اچھی بات ہے۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا، پھر روئے سخن جمیلہ کی طرف موڑتے ہوئے پوچھا۔

''جمیلہ! تمہارے ساتھ تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے؟''

''نہیں جی۔'' اس نے جلدی سے نفی میں گردن ہلا دی۔



''چاچا، چاچی تو بہت اچھے ہیں جی۔'' نبیلہ نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

''میرا مطلب ہے، جمیلہ کی امی اور ابو۔''

''میں تمہارا مطلب سمجھ گیا تھا، بیٹی!'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

جمیلہ بولی۔ ''نبیلہ واقعی سچ کہہ رہی ہے، تھانیدار جی! میرے امی ابو بہت ہی سمجھ دار ہیں۔ انہوں نے اپنی اولاد کے لئے ہمیشہ اچھا سوچا ہے۔ مجھے یقین ہے، ہماری شادیاں بڑے امن و امان سے ہو جائیں گی۔''

''تم لوگ کتنے بھائی بہن ہو؟'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

''ہم تین بہنیں ہیں۔'' جمیلہ نے بتایا۔ ''ہمارا کوئی بھائی نہیں۔''

''بیٹی یا بیٹا دینا قدرت کے ہاتھ میں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان معاملات میں انسان کا بس نہیں چلتا۔ ویسے بھی بیٹی، اللہ کی رحمت ہوتی ہے۔ تم بہنوں کو بھائی کی کمی تو ضرور محسوس ہوتی ہو گی، لیکن اس دنیا میں سب کو، سب کچھ نہیں ملتا۔ قدرت کی طرف سے جو عطا ہو، اس کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور..... جو بھی محرومی ہو، اس پر صبر کرنا چاہئے۔ اس حکمت کو اگر عملی زندگی میں داخل کر لیا جائے تو جیون بڑا پُرسکون ہو جاتا ہے۔''

انہوں نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا تو میں نے تسلی تشفی دے کر انہیں اپنے کوارٹر سے رخصت کر دیا۔ ان کے جانے کے بعد، میں نے جلدی جلدی یونیفارم پہنی اور اپنی ڈیوٹی پر ''حاضر'' ہو گیا۔ تھانے کے حالات معمول کے مطابق تھے۔

اس روز میں خلافِ معمول تھوڑی تاخیر سے تھانے پہنچا تھا، لیکن تھانے کے عملے نے میری اس ''دیری'' کو محسوس نہیں کیا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ آج کل راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

❀.....❀

بزرگوں کو کہتے سنا ہے اور میرے تجربے میں بھی آیا ہے کہ اپنی خوشی، سکون، آسانی، آرام اور چین کا زیادہ تذکرہ نہیں کرنا چاہئے۔ ان معاملات کو جتنا محدود رکھا جائے، اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اگرچہ حد سے تجاوز کر جائے تو پھر خوشیوں کو فوراً ہی نظر بھی لگ جایا کرتی ہے اور ایسا ہی معاملہ اس روز میرے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا ہے، ان دنوں تھانے میں راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ میں تھانے آیا تو اے ایس آئی وحید راٹھور میرے کمرے میں آ گیا۔ وحید ایک تجربہ کار اور سمجھ دار پولیس اہلکار تھا۔ مجھے اس تھانے میں تعینات ہوئے ابھی چند ماہ ہی ہوئے تھے اور اس مختصر سی مدت میں، میں نے وحید کے جوہر دیکھ لئے تھے۔ وہ ایک ایسا شخص تھا، جس پر مکمل بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ میں نے آزمائش کے لئے ایک دو مشن میں اسے اپنے ساتھ بھی رکھا تھا اور اس کی کارکردگی کو تسلی بخش پایا تھا۔ فارغ اوقات میں وہ میرے کمرے میں آ جاتا اور ہمارے درمیان دنیا کے ہر موضوع پر آزادانہ گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ وحید راٹھور کا شمار ان لوگوں میں ہوتا تھا، جن سے پہلی ہی ملاقات میں دوستی ہو جایا کرتی ہے۔

اس روز بھی میں اور وحید اپنی فرصت اور فراغت پر بات کر رہے تھے کہ یہ چرچہ قدرت کو پسند نہیں آیا اور دوپہر سے پہلے ہی ہمارے لئے مصروفیت کی بھرمار ہو گئی۔ تین چار ایسے معاملات آن پڑے تھے کہ انہیں نمٹانے میں شام ہو گئی۔ ذرا سانس لینا نصیب ہوا تو مجھے یاد آیا کہ نبیلہ والے مسئلے پر مجھے وحید راٹھور سے بات کرنا تھی۔ وحید اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ مقامی ہونے کے ناتے اسے یہ آسانی حاصل تھی کہ وہ وہاں کے لوگوں کو مجھ سے زیادہ جانتا تھا اور ان کے حوالے سے بہ نسبت زیادہ سہولت کے ساتھ معلومات اکٹھی کر سکتا تھا۔ میں نے فوراً ہی اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔

''وحید!'' وہ آ کر میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اسی گاؤں کے رہنے والے ہو۔ یہاں کے لوگوں کے بارے میں تمہیں سب کچھ معلوم ہو گا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

وحید راٹھور کی عمر پینتیس سال کے قریب رہی ہو گی۔ وہ پکے رنگ کا ایک دراز قامت شخص تھا۔ اس نے خاصی بھاری مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ سر کے بال آدھے سے زیادہ اُڑ چکے تھے۔ وہ کم گو تھا اور ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا لیکن مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے اس کی کم گوئی غائب ہو جاتی تھی، البتہ لہجے کا ٹھہراؤ برقرار رہتا تھا۔

میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''ملک صاحب! اس گاؤں کے ایک ایک بندے کو جاننے کا دعویٰ تو میں نہیں کر سکتا لیکن یہ ہے کہ تقریباً سبھی سے دعا سلام



ہے۔ مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ کیا کوئی مسئلہ کھڑا ہو گیا ہے؟''

اس نے اپنی بات کو سوالیہ جملے پر چھوڑا تو میں نے کہا۔ ''فی الحال تو کوئی مسئلہ نہیں ہے، لیکن روک تھام نہ کی گئی تو آگے چل کر مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔'' میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''دراصل، میں گاؤں کے چند لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں چوہدری مشتاق، حیات احمد اور اس کی بیوی عائشہ بی بی، ان دونوں کی بیٹی نبیلہ اور بشیر ترکھان کے بیٹے انور علی کے نام شامل ہیں۔''

وحید راٹھور نے سوچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ملک صاحب! ان تمام افراد سے تو میں اچھی طرح واقف ہوں، لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی کہ آپ کو ان کے بارے میں کس قسم کی معلومات درکار ہیں؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ حیات احمد کی بیوی عائشہ اپنے خاوند کو جوتے کی نوک پر رکھتی ہے۔ وہ بے چارہ کسی اُلّو کے مافق گھر کے کونے کھدرے میں پڑا رہتا ہے۔ گھر کے کسی معاملے میں اس کو شامل نہیں کیا جاتا اور..... عائشہ بالا ہی بالا نبیلہ کی شادی چوہدری مشتاق سے کرنے والی ہے۔ جب کہ نبیلہ، چوہدری سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ بشیر ترکھان کے بیٹے انور علی کو پسند کرتی ہے۔ یہ ہے ساری کہانی۔'' میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس کہانی کی حقیقت جاننا چاہتا ہوں تاکہ آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کیا جا سکے۔''

اس نے بڑے تحمل سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! میں بشیر ترکھان کے اکلوتے بیٹے انور علی کو تو جانتا ہوں لیکن مجھے یہ پتہ نہیں کہ کوئی نبیلہ اس کو پسند کرتی ہے، البتہ جہاں تک حیات احمد کی گھر والی، عائشہ کا تعلق ہے تو اس کا معاملہ خاصا گڑبڑ ہے۔''

''معاملہ خاصا گڑبڑ ہے..... کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ رازدارانہ انداز میں بتانے لگا۔ ''ملک صاحب! میری معلومات کے مطابق، عائشہ اچھے کردار کی عورت نہیں۔''

''میں نے سنا ہے، اس نے اپنے خاوند کو اُلّو کا گوشت کھلا رکھا ہے۔'' میں نے بدستور چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کہیں تمہارا اشارہ اس جانب تو نہیں وحید؟''

''نہیں.....'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''جناب! اُلّو کے گوشت والی کہانی تو میرے علم میں نہیں..... میرا اشارہ چوہدری صاحب کی طرف ہے۔''

''چوہدری صاحب..... تمہارے کہنے کا مطلب ہے، چوہدری مشتاق؟'' میری حیرت میں اضافہ ہو گیا۔

''جی..... میں چوہدری مشتاق ہی کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''لیکن.....'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''چوہدری مشتاق اور عائشہ کا آپس میں کیا تعلق؟''

''ملک صاحب! میں نے مر کر اپنی قبر میں جانا ہے۔'' وحید راٹھور نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے چونکہ اپنی آنکھوں سے کچھ نہیں دیکھا، اس لئے دعوے سے کچھ نہیں کہہ سکتا مگر.....'' وہ لمحاتی توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''مگر گاؤں میں عائشہ کے حوالے سے کوئی اچھا تاثر نہیں پایا جاتا۔ لوگ، ظاہر ہے کہ چوہدری سے ڈرتے ہیں اور اس کی ناراضگی کو برداشت نہیں کر سکتے اس لئے سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی خاموش رہتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لوگوں کے خیال میں عائشہ کوئی باکردار عورت نہیں۔ اس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ چوہدری مشتاق سے اس کے ناجائز تعلقات ہیں۔''

''تو کیا.... چوہدری مشتاق اس ٹائپ کا بندہ ہے؟'' میں نے تصدیقی لہجے میں پوچھا۔

اے ایس آئی نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

''ہوں.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''میں نے سنا ہے،



چوہدری مشتاق ساٹھ کے پیٹے میں ہے، اور عائشہ بھی پینتالیس کے اریب قریب ہے۔ اس عمر میں، جبکہ اولاد بھی جوان ہو چکی ہو تو انسان میں خاصا ٹھہراؤ آ جاتا ہے، لیکن.....''

میں نے پُرسوچ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑا تو وحید راٹھور نے جلدی سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ نے مردوں کے حوالے سے وہ محاورہ تو سنا ہو گا۔ ساٹھا پاٹھا..... تو اپنے چوہدری مشتاق کا شمار بھی ایسے ہی مردوں میں ہوتا ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں متوقف ہوا اور پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ عائشہ پینتالیس سال کی ہے لیکن شاید آپ نے اسے دیکھا نہیں۔''

''ہاں، میں نے اسے دیکھا نہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''کیوں..... کیا کوئی خاص بات ہے؟''

''وہ بہت خوب صورت عورت ہے۔'' وحید نے پُرمعنی لہجے میں بتایا۔ ''دیکھنے میں تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی۔ وہ کیا کہتے ہیں.....'' وہ لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے بولا۔ ''عائشہ نے سدا بہار جوانی پائی ہے۔''

''ایک ساٹھا پاٹھا اور دوسری سدا بہار.....!'' میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔ ''لیکن وحید! ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی۔''

''کون سی بات ملک صاحب؟'' اس نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

میں نے متذبذب انداز میں کہا۔ ''اگر عائشہ ''اس'' درجے پر چوہدری سے متعلق رہی ہے تو وہ اپنی بیٹی کی شادی چوہدری سے کیسے کر سکتی ہے؟ کیا اس میں اتنی سی عقل بھی نہیں؟''

''یہی بات مجھے بھی ہضم نہیں ہو رہی، ملک صاحب!'' وہ صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے کہا ہے تو میں اس معاملے پر غور کر رہا ہوں، ورنہ مجھے یقین تو بالکل نہیں آیا۔ یہ ٹھیک ہے، عائشہ ایک حسین و جمیل عورت ہے اور اس کی بیٹی نبیلہ بھی اسی پر گئی ہے، لیکن چوہدری مشتاق اس مزاج کا آدمی نہیں کہ وہ کسی مرحلے پر

ان سے شادی کے لئے تیار ہو جائے۔ یہ تو مخمل میں ٹاٹ کا پیوند والی بات ہو گی۔ چوہدری اپنی عیاشی کے لئے تو..... خیر، چھوڑیں ملک صاحب! مجھے مر کر خدا کو جواب دینا ہے۔ میں کسی کی عیب جوئی کر کے خوامخواہ گناہ گار نہیں ہونا چاہتا۔''

''میں بھی یہ نہیں چاہوں گا کہ تم گناہ گار ہو۔'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لیکن یہ تو پتہ چلنا چاہئے کہ اس شادی والی کہانی کی حقیقت کیا ہے؟''

''اس کے لئے تھوڑی تحقیق کرنا پڑے گی، ملک صاحب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، تم آج ہی اس منصوبے پر کام شروع کر دو۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اور جیسے ہی کوئی مثبت یا منفی نتیجہ سامنے آئے، تم فوراً مجھے آگاہ کرو۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہو گا۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر، ملک صاحب!'' وحید راٹھور نے فرمانبرداری سے کہا۔

''لیکن میں سمجھ نہیں سکا کہ آپ کس کیس پر کام کر رہے ہیں؟''

''میں سمجھتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وحید! تم میرے بھروسے کے آدمی ہو۔ اس بات کو خود تک ہی محدود رکھنا۔'' میں نے ذرا توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''وہ دراصل آج صبح عائشہ کی بیٹی نبیلہ اپنی ایک سہیلی جمیلہ کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ اس نے مجھے ان تشویش ناک حالات سے آگاہ کیا ہے اور ساتھ ہی روتے ہوئے مجھ سے یہ التجا بھی کی کہ میں کسی بھی طرح اس شادی کو روکنے کی کوشش کروں۔ وہ چوہدری مشتاق سے شدید نفرت کرتی ہے۔ اس کی خواہش تو یہی ہے کہ بشیر ترکھان کے لڑکے سے اس کی شادی ہو۔ مجھے تو یہ بچی نبیلہ بہت ہی دُکھی اور ستم رسیدہ لگتی ہے۔''

''جو حالات آپ نے بتائے ہیں، ان کی روشنی میں تو نبیلہ واقعی ہمدردی اور مدد کی مستحق ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جس حد تک ممکن ہو اور ہمارے اختیار میں ہو، ہمیں اس کی مدد بھی کرنا چاہئے۔'' وہ چند لمحات کے لئے خاموش ہوا، پھر مجھ سے سوال کر دیا۔



''ملک صاحب! نبیلہ آج صبح کس وقت تھانے آئی تھی؟''

''وہ تھانے نہیں، بلکہ میرے کوارٹر پر آئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس وقت میں تھانے آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اسی لئے آج میں قدرے دیر سے اپنے کمرے میں پہنچا ہوں۔''

''اوہ.....!'' اس نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''ملک صاحب! آپ مجھے صرف دو دن دے دیں، میں تیسرے دن اس معاملے کی مکمل رپورٹ آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ ''اس موضوع پر ہم دو دن بعد یعنی تیسرے روز بات کریں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

❀.....❀

اے ایس آئی وحید راٹھور نے مجھ سے دو دن کی مہلت لی تھی، لیکن اسے یہ تحقیق مکمل کرنے کا بھرپور موقع نہ مل سکا کیونکہ دوسرے دن کی صبح کو ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ یہ معاملہ کسی اور ہی سانچے میں ڈھلتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

فروری کی آٹھ تاریخ کو میں تھانے میں جا کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ مجھے اپنے کمرے کے باہر شور سا سنائی دیا، جیسے چند افراد آپس میں جھگڑا کر رہے ہوں۔ میں نے کانسٹیبل گل فراز کو آواز دے کر اسے اپنے پاس بلایا اور صورتِ حال جاننے کی کوشش کی۔

''گل فراز! یہ باہر کیا مچھلی بازار بنا ہوا ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ملک صاحب! چوہدری کے بندے ایک جوان کو مارتے ہوئے تھانے لائے ہیں۔ وہ اس کے خلاف کوئی اغوا شغوا کی رپورٹ درج کروانا چاہتے ہیں۔''

''کون ہے وہ بدبخت؟'' میں نے کانسٹیبل سے استفسار کیا۔

''وہ کم ذات، بدبخت یہ ہے تھانیدار صاحب!'' کانسٹیبل کے بجائے کسی اور نے میرے سوال کا جواب دیا۔

میں نے نگاہ اٹھا کر گل فراز کے عقب میں دیکھا۔ کھلے ہوئے دروازے میں بولنے والے کا چہرہ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ ایک ہٹا کٹا، دراز قامت شخص تھا، جس نے ایک جوان کو کالر سے دبوچ رکھا تھا۔ صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ بدبخت شخص یہی تھا جس کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان دونوں کے پیچھے، دو تین مزید افراد بھی نظر آئے، جن میں ایک خوب صورت عورت بھی شامل تھی۔ اگلے ہی لمحے ایک پستہ قامت بندے نے معتوب شخص کو بازو سے تھام لیا اور قدرے درشت لہجے میں بولا۔

"تھانیدار جی! اس کمینے کو حوالات میں بند کر دیں۔"

مجھے اس بندے کا انداز بہت برا لگا۔ میں نے معتوب شخص کو نظر انداز کرتے ہوئے اسی سے پوچھ لیا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ سینہ چوڑا کرتے ہوئے بولا۔ "جناب! میرا نام خوشیا ہے اور ہم چوہدری صاحب کے خاص بندے ہیں۔" اس نے اپنے دراز قامت ساتھی کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ دارا ہے۔ دارا مُرکی والا۔"

مذکورہ دراز قامت شخص کے ایک کان میں بالی ڈلی ہوئی تھی۔ گاؤں دیہات میں کان کے اس زیور کو مرکی کہا جاتا ہے۔ مُرکی والا ہٹا کٹا شخص وہی تھا، جس نے اس جوان کو کالر سے دبوچ رکھا تھا۔ خوشیا نے اسی حوالے سے اپنے ساتھی کا تعارف کرایا تھا۔

میں نے گھور کر پستہ قامت خوشیا کی آنکھوں میں دیکھا اور پوچھا۔

"تم نے اپنا اور اپنے ساتھی کا تعارف تو کرا دیا، تم دونوں کے انداز ہی سے پتہ چلتا ہے کہ تمہارے پیچھے کسی طاقت ور بندے کا ہاتھ ہے۔ اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ اس تھانے کا انچارج کون ہے؟"

خوشیا میرے سوال پر بری طرح چونکا، پھر اپنی توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

"جناب! تھانیدار تو آپ ہی ہیں۔"

"میں تھانیدار ہوں تو تھانیداری بھی مجھے ہی کرنے دو۔" میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "مجھے یہ بتانے یا سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ کس کو حوالات میں بند کرنا ہے اور کس کو ڈرائنگ روم کی سیر کرانا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"



"جناب! آپ تو خوامخواہ ناراض ہو رہے ہیں۔" دارا مُرکی والا نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ "ہم تو ایک خطرناک مجرم کو پکڑ کر آپ کے پاس لائے ہیں اور آپ الٹا ہمیں ہی جھڑک رہے ہیں۔"

"میں اُلٹا جھڑک رہا ہوں یا سیدھا، اس کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا۔" میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "دارا! تم پہلی فرصت میں اس کا کالر چھوڑ دو۔"

دارا نے ایک لمحے کے لئے مجھے متذبذب نظر سے دیکھا، پھر اس مسکین صورت شخص کو اپنی گرفت سے آزاد کر دیا۔ اس نے سکھ کی ایک گہری سانس لی اور تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ وہ شکل وصورت سے ایک بھلا مانس آدمی دکھائی دیتا تھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ہاں بھئی.....نام کیا ہے تمہارا؟"

"جی.....میں انور علی ہوں۔" وہ ڈرے سہمے لہجے میں بولا۔

"انور علی.....!" مجھے یہ نام شناسا سا محسوس ہوا لیکن فوری طور پر کچھ یاد نہ آ سکا۔ میں نے انور علی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے ایسا کون سا خطرناک جرم کیا ہے، جو یہ لوگ یوں دھکیل گھسیٹ کر یہاں لائے ہیں؟"

"اس کا جرم میں بتاتی ہوں، تھانیدار جی!" ان کے ساتھ آنے والی خوب صورت عورت نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "اس مردود نے میری بیٹی کو اغوا کیا ہے۔"

"بی بی! تم کون ہو؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"میرا نام عائشہ بی بی ہے جناب!" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "اور میری اکلوتی بیٹی کا نام ہے نبیلہ۔"

"اوہ.....!" ایک منظر میری یادداشت میں گھوم کر رہ گیا۔ "کیا.....کیا تم حیات احمد کی بیوی ہو؟" میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

"جی.....آپ بالکل ٹھیک پہچانے ہیں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی، پھر انور علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس شیطان نے میری بیٹی نبیلہ کو ورغلا کر پتہ نہیں، کہاں غائب کر دیا ہے۔ آپ اس کے خلاف پرچہ کاٹیں جی، اور اس کی اتنی پٹائی کریں کہ ہاتھ اور پاؤں جوڑ کر نبیلہ کا پتہ بتائے۔ اب یہ آپ کے حوالے ہے۔"

"تھانیدار جی: ان دونوں سانڈوں نے پہلے ہی مجھے بہت مارا ہے۔" انور علی نے فریادی لہجے میں کہا۔ "میں چوہدری مشتاق کے ڈر سے مار کھاتا رہا، ورنہ..... اگر یہ چوہدری کے بندے نہ ہوتے تو....." وہ جملہ نامکمل چھوڑ کر لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

"آپ مجھ سے جس کی بھی قسم لے لیں جناب! میں سچ کہتا ہوں، میں نے نبیلہ کو اغوا نہیں کیا..... اور نہ ہی اسے کہیں چھپا کر رکھا ہے۔"

"یہ جھوٹ بول رہا ہے جی۔" عائشہ چیخ کر بولی۔ "ایسی گھٹیا حرکت اس کمینے کے سوا اور کوئی کر ہی نہیں سکتا۔"

یہ ساری کہانی اب کھل کر میرے سامنے آ گئی تھی۔ میں نے کل صبح ہی نبیلہ کو دیکھا تھا اور اے ایس آئی وحید راٹھور کی زبانی عائشہ کے حُسن و جمال کی جو داستان سنی تھی، وہ لفظ بہ لفظ درست ثابت ہو رہی تھی۔ اس کہانی کی ابتدا ہی میں انور علی، نبیلہ، عائشہ، حیات احمد اور چوہدری مشتاق کے حوالے سے میں کافی تفصیل کے ساتھ بتا چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے، آپ بھی اس سچویشن کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔

نبیلہ اور انور علی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور آگے چل کر شادی کی خواہش رکھتے تھے، مگر عائشہ اپنی بیٹی نبیلہ کی شادی چوہدری مشتاق سے کرنے کی خواہاں تھی۔ نبیلہ، چوہدری کو سخت ناپسند کرتی تھی..... بلکہ اس سے شدید نفرت کرتی تھی اور اس بے جوڑ، غیر منطقی شادی کو رُکوانے کے لئے ہی وہ چھپ چھپا کر مجھ سے ملنے، اپنی سہیلی جمیلہ کے ہمراہ میرے کوارٹر پر آئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ انور علی مجھے ایسا شخص محسوس نہیں ہوتا تھا، جو نبیلہ کے اغوا میں ملوث رہا ہو۔

دوسری جانب چوہدری کے دو مسٹنڈوں کا، انور علی کو زدوکوب کرتے ہوئے تھانے تک لانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ چوہدری، انور کو کسی لمبے چکر میں، طویل عرصے کے لئے فٹ کرانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ موجودہ حالات کے تناظر میں ایسا ممکن بھی دکھائی دیتا تھا۔ مجھے سب سے پہلے یہ معلوم کرنا تھا کہ نبیلہ کب اور کتنے بجے سے لاپتہ ہے۔ اس کے بعد یہ تحقیق قدرے سہل ہو جاتی کہ اس کے اغوا میں کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ میں نے تو گزشتہ روز صحیح سلامت اسے اپنے کوارٹر سے رخصت کیا تھا۔



میں نے عائشہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بی بی! تم انور کو کمینہ، کم ذات اور پتہ نہیں، کیا کیا کہہ رہی ہو اور تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ذرا یہ تو بتاؤ، تم کس بنا پر اُسے موردِ الزام ٹھہرا رہی ہو؟"

"یہ..... یہ منحوس ہاتھ دھو کر میری بیٹی کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔" وہ انور کی طرف، نفرت انگیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "اسے ورغلاتا رہتا تھا۔ پیار محبت کی پٹیاں پڑھا کر اس کا دماغ خراب کر رکھا تھا اس نے۔ نبیلہ کی گمشدگی میں کسی اور کا ہاتھ ہو ہی نہیں سکتا تھانیدار جی! میں تو کہتی ہوں، آپ اسے فوراً پھانسی پر لٹکا دیں۔"

عائشہ کا منہ کھلتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک لڑاکا اور زبان دراز عورت تھی۔ اپنی آواز کی بلندی اور الفاظ کی چڑھائی کے بل پر وہ مدِ مقابل کو چت کرنے کے چکر میں رہتی تھی۔ ایسی تیز طرار اور جھگڑالو عورتوں سے نمٹنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ مجھے حیات احمد کی بے بسی اور بے کسی کا ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا۔ جمیلہ کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق، عائشہ نے حیات کو اُلّو کا گوشت کھلا رکھا تھا، جبھی وہ اُلّو بنا گھر کے ایک کونے میں پڑا رہتا تھا۔ لیکن عائشہ کے "جلال اور کمال" کو دیکھتے ہوئے میں بڑے وثوق سے کہہ سکتا تھا کہ ایسی عورتوں کو اُلّو کے گوشت یا افریقی گوریلے کی چربی کی قطعاً کوئی حاجت نہیں ہوتی۔ وہ اپنی زبان کی دھار ہی سے کام نکال لیتی ہیں۔ اس مزاج کی عورتوں کے شوہر یا تو انہیں چھوڑ دیتے ہیں اور یا پھر خود کو تپ دق میں مبتلا کر کے ساری عمر خون تھوکتے رہتے ہیں۔

میں نے عائشہ کے "مطالبے" کے جواب میں، ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بی بی! اگر میں انور کو پکڑ کر فوراً پھانسی پر لٹکا دوں گا تو پھر تمہاری بیٹی کا سراغ کیسے ملے گا؟ یہ تو پھانسی پر لٹکنے کے بعد کچھ بھی سننے یا بتانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اس لئے تم جلد بازی سے کام نہ لو اور اپنے جذبات کو کنٹرول میں رکھو۔"

اسے فوراً ہی اپنی حماقت کا احساس ہو گیا، ندامت آمیز نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "وہ جی..... میرا مطلب یہ تھا کہ یہ مردود کہیں اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔"

"تم نے چوہدری مشتاق کے بندوں کے زور پر اسے تھانے پہنچوا دیا ہے۔ اس وقت یہ میرے قبضے میں ہے۔ تم اس کے اِدھر اُدھر ہونے کی ذرا فکر نہ کرو۔" میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر دارا مُر کی والا اور خوشیا کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تم دونوں باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ اگر کسی مرحلے پر تمہاری ضرورت محسوس ہوئی تو میں تمہیں اندر بلا لوں گا۔"

انہوں نے متذبذب نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ان کے تیوروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باہر جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ سے کچھ کہنے کی کوشش کرتے، میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔

"تم لوگوں نے سنا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔ گمشدہ لڑکی کی ماں سے میں بات کر رہا ہوں نا۔ اور تمہارا پیش کردہ ملزم بھی میرے قبضے میں ہے۔" پھر میں نے کانسٹیبل گل فراز کی جانب دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"ان دونوں کو بتاؤ کہ تھانے کا برآمدہ کس طرف ہے اور اس برآمدے میں لکڑی کی بینچ کدھر رکھی ہے۔"

گل فراز میرا اشارہ پا کر ان کی جانب بڑھا تو وہ ناگوار نظروں سے کانسٹیبل کو گھورتے ہوئے خود ہی برآمدے کی سمت قدم بڑھانے لگے۔ کانسٹیبل نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں نے ایک فوری خیال کے تحت اس سے کہا۔

"گل فراز! تم انور کو حوالدار کے پاس لے جاؤ اور خود بھی وہیں بیٹھو۔ اس سے میں بعد میں بات کروں گا۔"

"او کے سر.....!" گل فراز نے فرمانبرداری سے کہا اور انور کو ہاتھ سے پکڑ کر میرے کمرے سے نکل گیا۔

میں اپنے سامنے بیٹھی تیز طرار عائشہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور کہا۔ "بی بی! تم فکر نہ کرو۔ اگر یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ تمہاری بیٹی کے اغوا میں انور کا ہاتھ ہے تو میں اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا، جسے دیکھ کر کسی کو پھر ایسے سنگین جرم کی جرأت نہیں ہو گی، لیکن....."



"لیکن کیا جی؟" میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر بولی۔

میں نے کہا۔ "لیکن یہ کہ..... اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری بیٹی کو فوراً بازیاب کروں تو تمہیں مجھ سے بھرپور تعاون کرنا ہو گا۔"

میں عائشہ کی زبان کھلوانے اور اسے اپنے اعتماد میں لینے کے لئے غیر محسوس انداز میں گھس رہا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"جی..... میں تو ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔ آپ حکم تو کریں۔"

اُس نے "آپ حکم تو کریں" کچھ ایسے انداز میں ادا کیا تھا کہ اگر میں مضبوط سوچ کا مالک نہ ہوتا تو کسی زبردست غلط یا خوش فہمی کا شکار ہو سکتا تھا۔ ان لمحات میں عائشہ کی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات کوئی اور ہی زبان بول رہے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کی گمشدگی کے لئے ذرا بھی پریشان نظر نہیں آتی تھی۔ میں نے نہایت ہی سنجیدہ لہجے میں اس سے کہا۔

"حکم صرف اتنا ہے کہ میں تم سے جو سوال کروں، اس کا بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔"

"جی..... پوچھیں آپ۔" وہ منتظر نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا۔

"کیا یہ سچ ہے کہ انور اور نبیلہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور آپس میں شادی کی خواہش رکھتے ہیں؟"

"تھانیدار جی! یہ جو انور ہے نا..... یہ بڑا ہی مکار اور عیار بندہ ہے۔ میں جانتی ہوں، نبیلہ کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یہی شیطان میری بچی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ خود کو اس کا عاشق کہتا ہے۔ بھلا آپ بتائیں..... یہ پیار محبت کی باتیں تو اچھی اچھی لڑکیوں کا دماغ خراب کر دیتی ہیں، میری نبیلہ تو بڑی سیدھی سادی ہے۔ وہ اس چالاک کی لچھے دار باتوں میں آ گئی ہے۔ لگتا ہے، جیسے اس بدبخت نے نبیلہ پر کوئی جادو کر دیا ہو۔ وہ تو اب میرے سامنے بھی زبان چلانے لگی ہے..... میرا مطلب ہے، زبان چلانے لگی تھی۔" بولتے بولتے اُس کی آواز بھرا گئی۔ "پتہ نہیں، میری بچی کس حال میں ہو گی۔ اس مردود نے اس کے ساتھ کیا، کیا ہے، کہاں لے جا کر چھپا

دیا ہے میری نبیلہ کو۔"

عائشہ نے میرے سوال کے جواب میں جو جذباتی تقریر کی، اس میں کام کی بات کوئی بھی نہیں تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یعنی تمہارا مطلب ہے، انور کے ورغلانے میں آ کر ہی سہی، نبیلہ بھی اس سے شادی کی خواہاں تھی۔ لیکن تمہیں اس رشتے پر سخت اعتراض تھا؟"

میں غیر محسوس انداز میں دھیرے دھیرے عائشہ کو اپنے مقصد کی طرف لا رہا تھا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"جی..... انور مجھے ایک آنکھ پسند نہیں۔ میں کبھی بھی نبیلہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی۔ میری بیٹی تو شہزادی ہے۔ اس لنگور کا اس سے کیا مقابلہ؟"

انور علی واجبی سی شکل وصورت کا مالک تھا، اسے لنگور کہنا سراسر زیادتی والی بات تھی، البتہ نبیلہ کے لئے "شہزادی" کا لفظ نہایت ہی موزوں اور مناسب تھا۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ میں عائشہ کو جس ٹریک پر لانا چاہتا تھا، وہ خاموشی سے ادھر ہی آ رہی تھی۔

ہوسکتا ہے، آپ کے ذہن میں یہ خیال آ رہا ہو کہ ایک لڑکی اغوا ہوگئی اور میں کوئی عملی اقدام کرنے کے بجائے اطمینان سے بیٹھا باتوں میں مصروف ہوں۔ لیکن یہ بتاتا چلوں کہ میں اطمینان سے نہیں بیٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں بند کر کے کسی بھی سمت الل ٹپ دوڑ پڑنا بھی دانش مندی نہیں ہوتی۔ ایسی کارروائی کے نتیجے میں عموماً ناکامیابی اور شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، اسی لئے میں نہایت ہوشیاری کے ساتھ وہ اشارے اور نکتے جمع کر رہا تھا، جن کی مدد سے میں چند خطوط واضح کر سکتا اور ان خطوط پر چلتے ہوئے نبیلہ کو بازیاب کروا لیتا..... پھر مجھے یہ بھی تسلی تھی کہ اس کیس کا ملزم انور علی میری کسٹڈی میں ہے۔

عائشہ کے بعد میں اس کو اپنے پاس بلاتا اور ایک کڑا انٹرویو کرتا۔ مجھے یقین تھا، عائشہ اور انور سے حاصل ہونے والی معلومات کے نتیجے میں، میں نبیلہ کا سراغ لگانے کی پوزیشن میں آ جاتا۔

میں نے عائشہ کے طنزیہ الفاظ کے جواب میں مصلحت بردار لہجے میں کہا۔ "میں



نے تمہاری بیٹی کو تو نہیں دیکھا، لیکن انور کے بارے میں تمہاری رائے سے مجھے مکمل اتفاق ہے۔ وہ بس ایویں سا ہی ہے۔"

مجھے اپنا ہم خیال پا کر اس کی آنکھوں میں خوشی چمکنے لگی، جلدی سے بولی۔

"آپ بڑے سمجھ دار تھانیدار ہیں..... مجھے یقین ہے، آپ میری بچی کو بہت جلد ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"اِن شاء اللہ!" میں نے مستحکم لہجے میں کہا۔ "تم جتنے خلوص سے تعاون کر رہی ہو، اس کے بعد میں بھی بڑا پُر اُمید ہوں۔" میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "یہ تو تم نے عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے کہ نبیلہ کو انور سے نہیں بیاہنا۔ لیکن تمہارے ذہن میں، اپنی بیٹی کے حوالے سے کوئی نام..... کوئی رشتہ تو ہوگا؟"

"وہ جی..... وہ جی....." وہ گڑبڑا گئی۔ "میں نے ابھی اس کے بارے میں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔"

میں نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "ابھی سوچا نہیں..... یا مجھے بتانا نہیں چاہتی ہو؟"

"جی ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس کی گڑبڑاہٹ میں کئی گنا اضافہ ہوگیا۔

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں محسوس کر رہا ہوں، تمہارے دل اور دماغ میں چوہدری مشتاق کے لئے بڑی گنجائش ہے؟"

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی، پھر بات بناتے ہوئے بولی۔

"تھانیدار جی! ہمارے چوہدری صاحب ہیں ہی اتنے اچھے کہ گاؤں کے سب لوگوں کے دل میں ان کی بڑی عزت ہے۔"

"میں سب گاؤں والوں کی بات نہیں کر رہا ہوں، عائشہ!" میں نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "میرا اشارہ تمہارے دل اور دماغ کی طرف ہے۔"

میں نے اسے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ گاؤں والے چوہدری کی عزت کس وجہ سے کرتے ہیں۔ کسی طاقت ور شخص کے خوف اور ڈر کے سبب اس کا احترام کیا جائے تو وہ اچھا نہیں ہو جاتا۔ بہرحال، عائشہ نے میرے معنی خیز سوال کے جواب میں بتایا۔

"جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں واقعی چوہدری مشتاق کی عزت کرتی ہوں۔"

"اور تمہاری بیٹی نبیلہ، چوہدری سے شدید نفرت کرتی ہے؟"

"جج..... جی ہاں..... جی نہیں....." وہ لڑکھڑاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

بات ختم کر کے وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اگر ایسی بات نہیں تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ وہ چوہدری کو تمہاری طرح بہت پسند کرتی ہے.....ہوں؟"

"جج..... جی ہاں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔

میں نے چڑھائی جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"اگر نبیلہ کو چوہدری مشتاق برا نہیں لگتا، وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تو پھر وہ اس سے شادی کرنے سے کیوں انکاری ہے؟"

"جی....." اس نے وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کیا آپ کو سب پتہ ہے؟"

"میں اس علاقے کا تھانیدار ہوں۔" میں نے نبیلہ اور جمیلہ سے ہونے والی ملاقات کا ذکر گول کرتے ہوئے کہا۔ "اور تھوڑی دیر پہلے تمہی نے کہا تھا کہ میں ایک سمجھ دار تھانیدار ہوں۔ ایک سمجھ بوجھ والا تھانیدار اپنے علاقے کے تمام لوگوں کے حالات و واقعات سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے۔ لہٰذا تمہیں اس حوالے سے ذہن کو اُلجھانے کی ضرورت نہیں کہ میں تمہارے گھریلو معاملات سے کیسے آگاہ ہو گیا ہوں۔ میری پکی معلومات کے مطابق، تم نبیلہ کو چوہدری سے بیاہ کر اس کی ساس بننے کا خواب دیکھ رہی ہو۔ مگر نبیلہ، چوہدری مشتاق سے ازحد نفرت کرتی ہے۔ اس کا دل انور علی میں اٹکا ہوا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟" میں نے سانس درست کرنے کے لئے لمحاتی توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے اتنا ضرور سوچ لینا کہ کسی بھی قسم کی غلط بیانی یا حقائق کی پردہ پوشی تمہیں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار کر سکتی ہے۔"



میرے دھمکی بھرے انداز نے اسے راہِ راست پر لاتے ہوئے، دروغ گوئی کی طرف نہیں جانے دیا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "تھانیدار جی! آپ بالکل صحیح کہہ رہے ہیں۔ واقعی، یہ میری خواہش ہے کہ نبیلہ کی شادی، چوہدری صاحب سے ہو جائے لیکن....." وہ تھوڑا متوقف ہوئی، افسوس ناک انداز میں گردن جھٹکی اور بوجھل آواز میں بولی۔

"لیکن اب تو نبیلہ ہی کہیں غائب ہو گئی ہے..... اُس اُلّو کے پٹھے انور نے پہلے اس کے دماغ میں چوہدری صاحب کے خلاف نفرت بھری، پھر اُسے کہیں غائب کر دیا۔"

"نبیلہ اگر غائب ہوئی ہے تو بہت جلد مل بھی جائے گی۔" میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ "اس کی تلاش کے لئے میں تم سے زیادہ تشویش میں مبتلا ہوں۔ تم فکر نہ کرو، میں اسے بہت جلد ڈھونڈ نکالوں گا۔ فی الحال ہم چوہدری مشتاق کی طرف آتے ہیں۔" میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

"عائشہ بی بی! ٹھیک ہے، تمہاری یہ خواہش تھی کہ نبیلہ کی شادی چوہدری مشتاق سے ہو جائے۔ کیا چوہدری بھی اس رشتے کے لئے تیار تھا؟"

"جی..... چوہدری صاحب بھی راضی تھے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ "چوہدری مشتاق کی عمر کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ میں نے سنا ہے، اس کی اولادوں کی اولادیں بھی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی ہیں۔"

"جی....." وہ جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ "چوہدری صاحب پکی عمر کے ہیں۔"

"پکی عمر.....؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چوہدری مشتاق کچھ زیادہ ہی پکی عمر کا نہیں عائشہ؟..... مجھے پتہ چلا ہے، وہ نبیلہ کے باپ سے بھی دس بارہ سال بڑا ہے۔ تمہاری مت تو نہیں ماری گئی، عائشہ بی بی؟"

"وہ جی..... عمر کم یا زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ "چوہدری صاحب اس عمر میں بھی بڑے زندہ دل اور صحت مند ہیں۔"

"ٹھیک کہتی ہو، بی بی!" نہ چاہتے ہوئے بھی میری زبان سے ایک سلگتا ہوا جملہ

نکل ہی گیا۔ ''یہ بات تم سے زیادہ اور کون جانتا ہوگا؟''

وہ جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

اے ایس آئی وحید راٹھور نے مجھے مبہم انداز میں عائشہ اور چوہدری کے پرائیویٹ تعلقات کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا، عائشہ کا حالیہ رویّہ اس کی تصدیق کر رہا تھا۔ میں نے سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''عائشہ بی بی! نبیلہ تمہاری بیٹی ہے۔ تم انور علی کو لنگور کہہ کر مسترد کر چکی ہو اور چوہدری مشتاق تمہاری نظر میں گبرو ہے۔ تم نبیلہ کی شادی جہاں بھی کرو، یہ میرا مسئلہ نہیں۔ میں کسی کے گھریلو معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔'' میں لمحے بھر کے لئے تھما، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ بتاؤ، نبیلہ کب سے غائب ہے؟''

وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''کل دوپہر سے جی۔''

''کل دوپہر سے۔'' میں نے اُلجھن زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''وہ کل سے غائب ہے اور تم آج اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آئی ہو؟''

''میں رپورٹ درج کرانے نہیں آئی جی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''بلکہ میں نے ملزم انور کو پکڑ کر آپ کے حوالے کیا ہے۔ آپ کا آدھا کام تو ہو گیا۔ اب انور کی زبان سے نبیلہ کا پتہ اُگلوانا آپ کی ذمے داری ہے۔''

میں نے قدرے اُکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم مجھے یہ بتانے کی کوشش نہ کرو کہ میری کیا ذمے داری ہے۔ میں اپنے فرائض سے اچھی طرح واقف ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کل دوپہر سے اب تک تم کیا کرتی رہی ہو؟''

میرے بدلے ہوئے انداز نے اسے بہت کچھ سمجھا دیا تھا، قدرے نرم لہجے میں بولی۔

''تھانیدار جی! آپ تو خوامخواہ خفا ہو رہے ہیں۔ سچی بات تو یہ ہے جی۔'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوئی، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔



''میں تو یہی سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہوگی، اس لئے فکر مند نہیں تھی۔ لیکن جب شام ہوگئی اور وہ گھر واپس نہیں آئی تو مجھے اس کی طرف سے تشویش ہوئی۔ میں نے اس کی سہیلیوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔ صبح وہ جمیلہ کے ساتھ تھی۔ دوپہر کو گھر آئی تھی اور کھانا وغیرہ کھانے کے بعد پھر گھر سے نکل گئی تھی۔ میری پوچھ پڑتال کے نتیجے میں یہ بات سامنے آئی کہ نبیلہ کو آخری مرتبہ کل دوپہر کے بعد تقریباً دو بجے کھیتوں میں انور کے ساتھ چھپ چھپ کر باتیں کرتے دیکھا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہیں آئی۔ میں نے اس کے لئے.....''

''ایک منٹ!'' میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''کل دوپہر دو بجے، نبیلہ اور انور کو کھیتوں میں چھپ کر باتیں کرتے ہوئے کس نے دیکھا تھا؟''

''چھیمو نے۔'' عائشہ نے جواب دیا۔ ''نیاز تیلی کی بیٹی چھیمو، کھیتوں کے پاس سے گزر رہی تھی کہ ایک جگہ، کھیت کی کھڑی فصل میں اسے حرکت دکھائی دی۔ وہ چونکی اور اپنی توجہ اس ''حرکت'' کی طرف لگا دی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اسے وہاں نبیلہ اور انور کی جھلک دکھائی دی۔ وہ راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے۔ چھیمو نے انہیں مخاطب کرنا یا ان کے رنگ میں بھنگ ڈالنا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ چھیمو نے یہ خاص بات کل رات ہی کو مجھے بتائی اور میں پریشان ہوگئی۔ میں سیدھی انور کے گھر پہنچی لیکن وہ کم بخت گھر میں نہیں ملا۔ اس کے باپ نے بتایا کہ وہ ساتھ والے پنڈ گیا ہے اور صبح واپس آئے گا۔ بشیر ترکھان نے بہت کرید کرید کر مجھ سے پوچھا کہ میں اس کے بیٹے انور کو کیوں ڈھونڈ رہی ہوں، مگر میں نے اسے نبیلہ کی گمشدگی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور واپس آگئی۔''

وہ سانس درست کرنے کے لئے رکی تو میں نے پوچھا۔ ''واپس کہاں آگئی؟''

''میں آپ کو بتا رہی تھی کہ بشیر ترکھان کے گھر سے واپس آگئی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہاں سے میں اپنے گھر نہیں آئی، بلکہ سیدھی چوہدری صاحب کے پاس ان کی حویلی چلی گئی۔ انہیں اس صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ بہت جلد نبیلہ کی ان سے شادی ہونے والی تھی۔''

''پھر چوہدری مشتاق نے تم سے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور کہنے لگے.....'' عائشہ نے بتایا۔

''اس وقت انور تو گاؤں میں موجود نہیں اور اس کے باپ سے کوئی بات کرنے کا فائدہ نہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ انور کی واپسی کا انتظار کیا جائے۔ وہ کل جب یہاں پہنچے گا تو میں اسے حویلی میں بلا کر خود اس کی خبر لوں گا۔ تم پریشان نہ ہو عائشہ! میں تمہاری بیٹی کو جلد تلاش کروا لوں گا۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لئے تھوڑا متوقف ہوئی، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''تھانیدار جی! میں چوہدری صاحب کے حکم پر خاموشی سے گھر آ گئی اور پوری رات نبیلہ کے بارے میں سوچتے ہوئے گزار دی۔''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارا بیٹا یعقوب، سودائی سا ہے؟'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس بے چارے کا گھر کے کسی معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں۔ لیکن حیات احمد نے اس موقع پر کیا ردِعمل ظاہر کیا تھا؟ میرا مطلب ہے کہ بیٹی کی گمشدگی نے اس پر کیا اثرات مرتب کئے تھے؟''

اس نے برا سا منہ بنایا اور کڑوے لہجے میں بولی۔

''حیات کا کچھ نہ پوچھیں، تھانیدار جی! وہ نہ تین میں ہے اور نہ ہی تیرہ میں۔ اگر وہ سمجھ دار اور معقول بندہ ہوتا تو مجھے یہ دن ہی نہ دیکھنے پڑتے۔ اسے سارا دن گھر میں پڑ کر چارپائی توڑنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ وہ حیات نہیں.... بلکہ میرے لئے ایک عورت ہے۔''

میں نے اُلّو کے گوشت کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی کہ کہیں بحث کا ایک نیا در نہ کھل جائے۔ میں نے اس کے چہرے پر نمودار ہونے والے تاثرات کا بہ غور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''آج صبح کیا واقعات پیش آئے ہیں؟ انور علی تم لوگوں کو کہاں سے ملا ہے؟''

''چوہدری صاحب نے رات مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا، لیکن اب پتہ چلا ہے کہ انہوں نے دارا اور خوشیاں کی رات ہی کو ڈیوٹی لگا دی تھی کہ انور جیسے ہی گاؤں میں داخل ہو، اسے پکڑ کر تھانے لے جائیں۔ بس جی، پہلے انہوں نے اس لفنگے کو قابو کیا، پھر ایک بندہ میری طرف دوڑا کر مجھے بھی بلا لیا اور ہم سب مل کر تھانے آ



گئے۔ یہ ہے ساری کہانی جی۔''

''رات کو چوہدری نے تم سے کہا کہ وہ انور کو اپنی حویلی میں بلا کر اس سے پوچھ گچھ کرے گا، لیکن بعد میں اپنے بندوں کو حکم دیا کہ وہ انور کو پکڑ کر سیدھے تھانے لے جائیں۔ چوہدری کی یہ ادا میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

''پتہ نہیں جی.....انہوں نے ایسا کیوں کیا۔'' وہ متذبذب لہجے میں بولی۔ ''یہ بات تو آپ انہی سے پوچھیں جی۔''

''چوہدری سے ملاقات ہو گی تو میں یہ سوال اس سے ضرور کروں گا۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''فی الحال تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا بشیر ترکھان کو اس بات کا پتہ ہے کہ اس کے بیٹے کو تھانے پہنچا دیا گیا ہے؟''

''نہیں جی۔'' اس نے بڑی شدت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرا خیال ہے، گاؤں میں ابھی کسی کو بھی اس واقعے کی خبر نہیں۔ یہ ساری کارروائی چوہدری صاحب کے بندوں نے چھپ چھپاتے کی ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اب اس سلسلے میں جو کچھ بھی میں کروں گا، وہ سب چھپ چھپاتے ہی ہو گا۔''

''جی.....کیا مطلب؟'' اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''عائشہ! میں نے تمہاری شکایات توجہ سے سن لیں۔ تمہیں اپنی بیٹی کی گمشدگی کے سلسلے میں جس بندے پر پکا شک ہے، وہ اس وقت میری تحویل میں ہے۔ تم آرام سے گھر جاؤ، میں انور علی کی زبان کھلوانے کے لئے نیا عمل شروع کرتا ہوں۔ اِن شاء اللہ! بہت جلد نبیلہ کو بازیاب کر لیا جائے گا اور.....'' میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''اور چوہدری کے ان دو ڈشکروں کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ جو باہر برآمدے میں بیٹھے ہیں۔ ان کی تھانے میں کوئی ضرورت ہے اور نہ ہی کام۔ میں اپنے معاملات میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا، چاہے وہ کوئی چوہدری ہو یا چوہدری کا گماشتہ!''

میری بات عائشہ بی بی کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میر

شکریہ ادا کرنے کے بعد خاموشی سے رخصت ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے انور علی کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ مسکین سی صورت کے ساتھ میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بے حد سہما ہوا اور ڈرا ڈرا سا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا تمہیں پتہ ہے، چوہدری کے بندوں نے تمہیں کس چکر میں پکڑ کر تھانے پہنچایا ہے؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بتایا۔

''یہ لوگ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ میں نے نبیلہ کو اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔''

''تو کیا واقعی تم نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے؟'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں، جناب!'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں نے یہ جرم نہیں کیا۔ مجھے تو لگتا ہے، چوہدری نے خود ہی نبیلہ کو کہیں غائب کرایا ہے اور مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے تمہاری بات کا یقین کر لیتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''اب تمہیں یہ بتانا پڑے گا کہ چوہدری تم سے کیوں دشمنی کر رہا ہے۔ کیا تم نے اس کی بھینس چوری کر لی ہے؟''

''وہ جناب!..... بات دراصل یہ ہے کہ.....'' وہ بولتے بولتے متذبذب انداز میں خاموش ہو گیا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انور! تمہیں جو بھی کہنا ہے، کھل کر کہو۔ تھانے میں صرف مجرموں کو کڑی آزمائشوں سے گزارا جاتا ہے۔ بے گناہ لوگوں کے ساتھ میں بڑی عزت سے پیش آتا ہوں۔''

اس کے چہرے پر اطمینان کا رنگ جھلکنے لگا، تھوک نگلتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! ہمارے گاؤں کا چوہدری بڑا ہی عیاش اور ظالم شخص ہے۔ اس نے نبیلہ پر بھی بری نظر رکھی ہوئی ہے۔ عائشہ پوری طرح اس کی مٹھی میں ہے۔ اس



نے عائشہ کو یہ راگ دیا ہے کہ وہ نبیلہ سے شادی کرے گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ ایک نمبر کا جھوٹا ہے اور عائشہ کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ وہ نبیلہ کو عیاشی کا کھلونا سمجھ کر چند روز اس سے کھیل تو سکتا ہے، لیکن اس سے شادی کبھی نہیں کرے گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی تک تم نے اس بات کی وضاحت نہیں کی کہ چوہدری تم سے کیوں دشمنی کر رہا ہے؟''

''وہ جی، دراصل..... وہ مجھے اپنا رقیب سمجھتا ہے۔'' وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ ''یا یوں سمجھ لیں کہ مجھے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتا ہے۔ کیونکہ نبیلہ اس سے شدید نفرت کرتی ہے۔ وہ مجھے چاہتی ہے اور میں اسے چاہتا ہوں۔ چوہدری نے نبیلہ کو غائب کرا کے مجھے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا ہے جب کہ میرا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ مجھے تو یہاں آ کر پتہ چلا ہے کہ نبیلہ کل دوپہر سے غائب ہے۔ اس کے لئے جتنا پریشان میں ہوں، اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا جناب!''

اس کی پریشانی میں کوئی کھوٹ نظر نہیں آتا تھا۔ ان لمحات میں وہ واقعی بے حد الجھا ہوا اور فکرمند دکھائی دیتا تھا۔ میں چند لمحات تک یک ٹک اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا، پھر نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے، تم نبیلہ سے سچی محبت کرتے ہو؟''

وہ اٹل انداز میں بولا۔ ''جی ہاں..... بالکل!''

''پھر تو تمہیں یہ بھی پتہ ہوگا کہ محبت کرنے والے جھوٹ نہیں بولتے۔''

''جی پتہ ہے۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اور میں نے آپ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔''

''یعنی نبیلہ کے اغوا..... یا گمشدگی میں تمہارا کوئی ہاتھ نہیں؟''

''نہیں..... بالکل نہیں۔'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''کل شام میں نبیلہ کی ماں عائشہ تمہارے گھر گئی تھی۔ اس نے تمہارے باپ سے تمہارے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ تم ساتھ والے گاؤں گئے ہوئے ہو اور آج صبح واپس آؤ گے۔ کیا یہ سچ ہے؟''

''جی ہاں، میں کل سہ پہر میں، اپنی خالہ سے ملنے گیا تھا، جو ساتھ والے گاؤں

میں رہتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پروگرام کے مطابق، مجھے آج صبح واپس آنا تھا اور میں آیا بھی، لیکن گاؤں میں قدم رکھنے سے پہلے ہی چوہدری کے بندوں نے مجھے مارنا شروع کر دیا اور یہاں تھانے لے آئے۔ انہی کی زبانی مجھے پتہ چلا کہ نبیلہ کل دوپہر سے غائب ہے۔ یہ لوگ مجھ پر شک کر رہے ہیں کہ میں نے اسے اغوا کر کے کہیں چھپا دیا ہے۔''

''ان کے شک کا سبب یہ ہے کہ آخری بار کل دوپہر کے بعد نبیلہ کو تمہارے ساتھ دیکھا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم دونوں کھیتوں میں چھپ کر راز و نیاز کر رہے تھے..... ہے نا؟''

وہ جھینپے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جی ہاں، ہم آپس میں اسی طرح چھپ کر ملتے ہیں۔ کل وہ بہت پریشان تھی۔ چوہدری کے حوالے سے، شادی کے لئے اس پر ماں کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہمارے درمیان بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس نے مجھے آپ کے بارے میں بھی بتایا تھا۔''

انور کے آخری جملے نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''میرے بارے میں کیا بتایا تھا اُس نے؟''

''جناب! وہ کل صبح جمیلہ کے ساتھ آپ سے ملنے آئی تھی۔'' انور نے کہا۔ ''اس نے اپنے تمام حالات آپ کے سامنے رکھے تھے اور آپ سے مدد کی درخواست کی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ نے اس کی مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ میں تو یہ سن کر کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ میں نے نبیلہ کو تسلی دی اور خالہ کے گھر چلا گیا، لیکن جب واپس آیا ہوں تو یہاں کے حالات ہی بدلے ہوئے ہیں۔ آپ نے تو اُلٹا مجھے ہی تھانے میں بند کر دیا ہے جی!''

صورتِ حال پوری طرح واضح ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا، انور جھوٹ کا سہارا نہیں لے رہا۔ اس کی بپتا سے ثابت ہوتا تھا، نبیلہ کی گمشدگی میں اس کا کوئی ہاتھ نہیں۔ ان سنسنی خیز حالات میں دھیان چوہدری مشتاق کی طرف جاتا تھا۔ اغلب امکان یہی تھا کہ چوہدری ہی نے نبیلہ کو غائب کروایا ہوگا۔ میں نے انور کی اُلجھن کے جواب میں کہا۔



''انور! تمہیں تھانے پہنچانے میں میرا نہیں، بلکہ چوہدری کے بندوں اور عائشہ کا ہاتھ ہے۔ اور میرا خیال ہے، یہ تمہارے حق میں بہتر ہی ہے۔''

''جی..... کیا مطلب؟'' وہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں تم اگر تھانے میں ایک دو روز رہو تو تمہارے لئے اچھا ہے۔ تم یہاں زیادہ محفوظ ہو۔ اگر باہر آزادانہ گھومتے رہے تو چوہدری کسی بھی ذریعے سے تمہیں نقصان پہنچا سکتا ہے اور جہاں تک میرے وعدے کا تعلق ہے.....'' میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے نبیلہ سے جو وعدہ کیا ہے، اسے ضرور پورا کروں گا۔ میں نے اپنی تحقیق سے یہ پتہ چلا لیا ہے کہ نبیلہ حق پر ہے، اس کی ماں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ وہ اس کی شادی چوہدری سے کر کے بڑا ظلم کرنا چاہتی ہے اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔''

''میری عمر بھی اللہ آپ کو دے دے۔'' وہ دعائیہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بہت عظیم ہیں۔ آپ ہمارے لئے کسی فرشتے سے کم نہیں ہیں۔''

میں نے اس کی بات پوری توجہ سے سنی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''انور علی! اللہ تعالیٰ نے ہر ذی روح کے لئے عمر کا ایک کوٹا مقرر کر رکھا ہے اور کسی کی عمر کسی کو نہیں لگا کرتی۔ لہٰذا اس قسم کی دعائیں نہیں کرنا چاہئیں۔ اور یہ بھی ذہن میں رکھو کہ میں کوئی فرشتہ نہیں ہوں، بلکہ تمہاری ہی طرح گوشت پوست کا انسان ہوں۔ میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں یا آگے چل کر جو کروں گا، وہ میرے فرائض کا تقاضا ہے، اس میں تم پر کوئی احسان نہیں۔'' میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تم ایک دو دن اِدھر تھانے ہی میں سرکاری مہمان بن کر گزارو۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ تمہارے یہاں رہنے سے چوہدری مطمئن رہے گا کہ میں تم پر سختی کر کے نبیلہ کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا ہوں۔ میں اس دوران میں، نہایت ہی خفیہ طور پر نبیلہ کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا اور میرا خصوصی ٹارگٹ چوہدری مشتاق ہوگا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، جناب!'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''اور مجھے یقین ہے، بلکہ میری دعا ہے کہ آپ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ مجھے آپ کی تحویل میں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، لیکن میرے ماں باپ کو جو پریشانی ہوگی، اس کا کیا حل ہے؟''

''اس کا بھی حل ہے میرے پاس۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''تمہیں اس سلسلے میں ذرا بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بشیر ترکھان اور نذیراں کو اچھی طرح سمجھا دوں گا، وہ تمہاری گرفتاری کی خبر سن کر تھانے آئیں گے تو میں ان سے بات کرلوں گا۔''

''میری ماں نذیراں کو بہت کم نظر آتا ہے۔ آپ اسے ایک اندھی عورت ہی سمجھیں جناب!'' وہ دُکھی لہجے میں بولا۔ ''وہ کہیں آتی جاتی نہیں، گھر ہی میں رہتی ہے۔ یہاں تو مجھ سے ملنے میرا باپ ہی آئے گا۔''

''میں نے کہا نا، تم اپنے ذہن کو مت اُلجھاؤ۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''میں سب سنبھال لوں گا۔''

''ٹھیک ہے جی۔'' وہ ایک گہری، اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر انور علی کو دوبارہ حوالدار بہادر علی کے پاس بھجوا دیا۔ اسی وقت اے ایس آئی وحید راٹھور میرے کمرے میں داخل ہوا۔ وحید اسی گاؤں کا رہنے والا تھا، لہٰذا رات کو اپنے گھر چلا جاتا تھا اور صبح وقت پر ڈیوٹی سنبھال لیتا تھا۔ مگر آج وہ تقریباً دو گھنٹے لیٹ تھا۔

وہ سلام کر کے میرے سامنے بیٹھ چکا تو میں نے کہا۔ ''وحید! تھانے کے قریب رہائش ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ انسان کا جب دل چاہے، اٹھ کر چلا آئے؟''

''نہیں ملک صاحب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''ایسی بات نہیں۔ آپ جانتے ہیں، میں نے ہمیشہ وقت کا خیال رکھا ہے..... وہ دراصل، رات سے میری گھر والی کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ آج رات کو وہ چھوٹے بچے کو نہیں دیکھ سکی، لہٰذا مجھے بار بار اُٹھ کر اُسے دیکھنا پڑا۔ بلکہ یوں سمجھیں کہ یہ رات میں نے جاگ کر گزاری ہے..... اسی لئے صبح کے وقت ایسی آنکھ لگی کہ پھر دن چڑھے ہی اُٹھ سکا ہوں۔'' وہ



لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر دھیرے سے بولا۔

''اب تو آپ میری تاخیر کی وجہ سمجھ گئے ہوں گے؟''

''بالکل سمجھ گیا ہوں۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہاری بیوی کی طبیعت کیسی ہے؟''

وحید راٹھور کے تین بچے تھے۔ بڑی بیٹی آٹھ سال کی، اس سے چھوٹے بیٹے کی عمر تین سال تھی اور تیسرا، سب سے چھوٹا بیٹا صرف چھ ماہ کا تھا۔ یہ بچہ جب سے پیدا ہوا تھا، وحید کی بیوی صغریٰ کی طبیعت پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ دو چار دن میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا اور اس ''ہونے'' کو نمٹنے یا بھگتنے کے لئے وحید کو زیادہ وقت گھر پر دینا پڑتا تھا۔ اس گاؤں میں وحید کا کوئی قریبی عزیز رشتے دار موجود نہیں تھا۔ وہ اپنے گھریلو حالات اور مسائل کے بارے میں اکثر مجھ سے تبادلۂ خیال کرتا رہتا تھا۔

''اب تو وہ خاصی سنبھل گئی ہے۔'' میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''لیکن دن میں ایک دو دفعہ مجھے گھر کا چکر لگانا پڑے گا۔'' وہ قدرے متوقف ہوا، پھر افسوس ناک لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! میں اپنی اس گھریلو پریشانی کے سبب اس مسئلے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا ہوں، جس پر ہم نے رات کو تفصیلی بات کی تھی۔ میں گھر پہنچ کر ایسا مصروف ہوا کہ کچھ خبر نہیں، اس وقت سے لے کر اب تک گاؤں میں کیا ہوتا رہا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُٹھا ہوں اور تھوڑا کھا پی کر تھانے آ گیا ہوں۔''

''تمہارے لہجے میں اسی لئے افسوس کا عنصر شامل ہے کہ تمہیں کچھ پتہ نہیں، آج کا سورج طلوع ہونے سے لے کر اب تک اس گاؤں خصوصاً تھانے میں کیا انقلابی واقعات پیش آ چکے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جس کام پر توجہ نہ دے پانے کی وجہ سے افسردہ ہو، سمجھو وہ کام پچھلے دو تین گھنٹوں میں آدھے سے زیادہ ہو چکا ہے۔ بس، چند ایک آخری مناظر باقی ہیں۔''

''کک..... کیا مطلب.....؟'' حیرت کی شدت سے اس کی آنکھیں پھیل سی گئیں۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، ملک صاحب! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں، وحید راٹھور!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں، میں نے اُسے حالات کی تیزی سے بدلتی ہوئی صورت سے آگاہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنی رائے اور اندازوں کا بھی ذکر کیا۔ وہ حیرت اور دلچسپی کی ملی جلی کیفیت کے ساتھ مجھے سنتا رہا اور جب میں خاموش ہوا تو وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! مجھے پکا یقین ہے، نبیلہ کی گمشدگی میں چوہدری مشتاق کے سوا اور کسی کا ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا ہے، یعنی نبیلہ بھی اسے حاصل ہو جائے اور اس کی راہ کا کانٹا انور علی بھی بڑی صفائی سے ٹھکانے لگ جائے۔''

''گویا تم انور علی سے اتفاق کرتے ہو۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اس نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے؟''

''ہاں..... بڑی حد تک۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولا۔ ''لیکن میرے ذہن میں نبیلہ کی گمشدگی کا ایک اور بھی پہلو ہے، جس کے بارے میں انور نے سوچا بھی نہیں ہو گا۔''

''ہوں.....!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور پوچھا۔ ''اور وہ مختلف پہلو کون سا ہے؟''

وہ سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ انور کے خیال میں چوہدری مشتاق نے اپنے بندوں کی مدد سے نبیلہ کو اس طرح غائب کروایا ہے کہ اس کی گمشدگی کا شک سیدھا اس پر جائے۔ پولیس، انور کو نبیلہ کے اغوا کے الزام میں پکڑ کر کسی مصیبت میں ڈال دے اور چوہدری کی عید ہو جائے۔ بعد ازاں نبیلہ کو اس طرح برآمد کیا یا کرایا جائے کہ ہر صورت میں انور ہی قصوروار دکھائی دے۔ لیکن میں نے جس پہلو کا ذکر کیا ہے نا جناب....!'' وہ ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا، پھر انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔

''میرے خیال میں، اس کھیل میں نبیلہ کی ماں عائشہ بھی چوہدری مشتاق کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ وہ جانتی ہے کہ نبیلہ کو کہاں غائب کیا گیا ہے۔ اس کا رونا دھونا اور بیٹی کے لئے پریشان ہونا محض اداکاری بھی ہوسکتی ہے۔ ملک صاحب! پتہ نہیں، مجھے کیوں یقین سا محسوس ہو رہا ہے کہ یہ ڈراما ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت



رچایا گیا ہے۔''

''اگرچہ تمہاری باتوں پر تصدیقی مہر تو نہیں لگائی جا سکتی لیکن ان میں خاصا وزن پایا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''نبیلہ کی بازیابی کے لئے عائشہ اور چوہدری مشتاق کو باری باری ایک ہی کسوٹی پر پرکھنا پڑے گا اور..... یہ کام ابھی سے شروع سمجھو۔''

''لگتا ہے، آپ نے اپنے ذہن میں کوئی لائحہ عمل تیار کر لیا ہے۔'' وہ پُرجوش انداز میں بولا۔

میں نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

❁.....❁

دوپہر کے کھانے کے بعد میں تھانے سے نکلا اور چوہدری مشتاق کی حویلی کی جانب قدم بڑھا دیئے۔ چوہدری کی حویلی اسی گاؤں میں موجود تھی اور تھانے سے بہ مشکل دس منٹ کے فاصلے پر تھی۔ میں اگر چاہتا تو سائیکل، گھوڑے یا تانگے کے ذریعے چوہدری سے ملنے جا سکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرے ذہن میں سوچوں کا ایک ہجوم سا لگا ہوا تھا اور میں ایک لائحہ عمل ترتیب دے رہا تھا۔ لہٰذا میں نے دانستہ پیدل جانے کا فیصلہ کیا، تاکہ جلد از جلد کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔

یہ بات دیکھنے، سننے اور پرکھنے میں آئی ہے کہ چہل قدمی کے دوران انسان کا ذہن زیادہ فعال ہوتا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ اس کے دماغ میں اٹک کر رہ گیا ہو تو اس ''عمل'' کے ذریعے وہ بہ نسبت آسانی سے مسئلے کے حل تک پہنچ جاتا ہے۔ نیوٹن، ایڈیسن اور آئن اسٹائن نے بہت ساری سائنسی گتھیاں ٹہل ٹہل کر اور چہل چہل کر ہی سلجھائی تھیں!

میں چوہدری مشتاق کی حویلی تک بعد میں پہنچا، مجھ سے پہلے میری آمد کی خبر وہاں تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ حویلی کے گیٹ پر ایک ہٹے کٹے ڈشکرے نے میرا بڑا پُرجوش استقبال کیا اور فدویانہ انداز میں بولا۔

''آئیں جی..... تھانیدار صاحب!..... چوہدری صاحب اس وقت حویلی کے اندر موجود ہیں۔ میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور تیکھے لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے، تمہارے

چوہدری صاحب میرے ہی انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔"

"او جناب! آپ تو اس علاقے کے بادشاہ ہیں۔" وہ مسکہ لگانے والے انداز میں بولا۔ "چوہدری صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے رہتے ہیں۔"

اس شخص کی باتوں سے مجھے بہ خوبی اندازہ ہو گیا کہ چوہدری نے تھانے اور گاؤں کے معاملات پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے۔ بہرحال، میں نے چوہدری کے بندے کے ساتھ زیادہ بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھا اور اس کی معیت میں ایک سجے سجائے کمرے میں پہنچ گیا، جو یقیناً چوہدری کی بیٹھک تھی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد چوہدری مشتاق بھی وہاں آ گیا۔

یہ چوہدری سے رو بہ رو میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کی عمر ساٹھ سے متجاوز تھی۔ جثّے سے اندازہ ہوتا تھا، جوانی میں وہ کسرت کا عادی رہا ہوگا۔ ڈنڈ پٹی ابھی تک قائم تھی۔ وہ ایک دراز قامت شخص تھا۔ اسے ایک نظر دیکھ کر ذہن میں پنجابی فلموں کے ایک معروف ولن کا تصور اُجاگر ہوتا تھا۔ عمر کے اس حصے میں بھی اس کی صحت قابلِ تحسین تھی۔ گویا عائشہ نے اس کی مستعدی اور کارکردگی کے بارے میں جو دعویٰ کیا تھا، وہ کچھ غلط بھی نہیں تھا۔

چوہدری بڑے تپاک سے مجھ سے ملا، اس کے انداز میں بڑا جوش اور دوستانہ پن پایا جاتا تھا۔ اپنے ابتدائی تاثر سے وہ خاصا زندہ دل اور خوش مزاج ثابت ہو رہا تھا۔ میں نے بھی جواباً گرم جوشی کا مظاہرہ کیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد ہم ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ گئے۔

چوہدری نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ملک صاحب! نبیلہ کی گمشدگی ایک حوالے سے اچھی ثابت ہو رہی ہے کہ اس بہانے آپ سے ملاقات تو ہو گئی، ورنہ....." وہ لمحے بھر کے لئے تھما، پھر معنی خیز انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

"ورنہ آپ کو اس تھانے میں تعینات ہوئے اب کافی دن ہو گئے ہیں۔ لیکن نہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو سکا اور نہ ہی محکمہ جاتی مصروفیات نے آپ کو اس زحمت کی فرصت دی۔ بہرحال، بہانہ کوئی بھی ہو..... خوشی اس بات کی ہے کہ ہماری



ملاقات ہو گئی۔"

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ نبیلہ کے ذکر پر چوہدری کی آنکھوں میں ایک مخصوص چمک اُبھر آئی تھی۔ اس چمک کو حیوانی یا ہوس کی چمک کہا جا سکتا ہے۔ اس کے تاثرات سے یہ بھی سمجھ میں آیا کہ وہ نبیلہ اور اس کے معاملے میں خصوصی دلچسپی رکھتا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"چوہدری صاحب! آپ کی بات سے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ابھی تک ہماری ملاقات نہیں ہوئی تھی تو اس میں ہم دونوں برابر کے قصور وار ہیں۔ خیر، کسی بھی سبب سہی، ہم آج ایک دوسرے سے مل تو لئے۔"

اس نے کہا۔ "اور سنائیں..... آج کل تھانے داری کیسی چل رہی ہے؟"

اصولی طور پر اسے سب سے پہلے نبیلہ کے بارے میں استفسار کرنا چاہئے تھا۔ اس کی عملداری میں ایک نوجوان اور خوب صورت لڑکی غائب ہو گئی تھی اور جس کے اغوا کا ملزم تھانے میں بند تھا۔ فطری طور پر اس کے اندر یہ تجسّس نظر آنا چاہئے تھا کہ ملزم انور نے کیا اُگلا۔ وہ نبیلہ کی گمشدگی کے حوالے سے کیا کہانی سنا رہا ہے اور اس نے مغویہ کی بازیابی کے لئے کیا لائحہ عمل تیار کیا ہے۔ مگر چوہدری نے ان امور سے متعلق کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ اپنے انداز اور تاثرات سے بڑا پُرسکون اور مطمئن دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اس کے سوال کے جواب میں گہری سنجیدگی سے کہا۔

"چوہدری صاحب! اب آپ مجھ سے یہ سوال تو نہ کریں کہ تھانیداری کیسی چل رہی ہے۔ بھلا کون سا معاملہ آپ کی نظر سے اوجھل ہے۔ آپ کا تو ایک ادنیٰ سا ملازم بھی یہ جانتا ہے کہ میں آپ سے ملنے آیا ہوں اور وہ مجھے اطلاع دیتا ہے کہ..... چوہدری صاحب اس وقت حویلی کے اندر موجود ہیں، میں آپ کو ان کے پاس لے چلتا ہوں۔"

میرا اشارہ اس بندے کی جانب تھا، جو مجھے حویلی کے گیٹ پر ملا تھا اور جس کی راہنمائی میں، میں اس بیٹھک تک پہنچا تھا۔

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ "کیا کریں جی..... نظر تو رکھنی پڑتی ہے نا۔ تھانیداری اور چوہدراہٹ قائم رکھنے کے لئے اپنے مخبروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ آپ

تو اس بات کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں۔"

"آپ صحیح کہہ رہے ہیں، چوہدری صاحب!" میں نے مبہم انداز میں کہا۔

اسی وقت ایک ملازم بڑی سی ٹرے اٹھائے بیٹھک میں داخل ہوا۔ یقیناً چوہدری نے ادھر آنے سے پہلے میری خاطر داری کے لئے احکام جاری کئے ہوں گے۔ ملازم نے میرے سامنے رکھی میز پر سامانِ خورونوش چن دیا۔ میں نے کہا۔

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی، چوہدری صاحب! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی کھانا کھایا ہے۔"

"وہ تو آپ نے اپنے تھانے میں کھایا ہو گا نا!" چوہدری نے ملازم کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ پہلی مرتبہ میرے غریب خانے پر تشریف لائیں اور کچھ کھائے پیئے بغیر ہی چلے جائیں۔ تھوڑا بہت تو آپ کو لینا ہی پڑے گا، ملک صاحب!"

ملازم، چوہدری کا اشارہ بہ خوبی سمجھ گیا تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ گردن جھکا کر بیٹھک سے نکل گیا۔ میں چوہدری کے فرمائشی الفاظ "تھوڑا بہت" کے مطابق، نعمت خداوندی سے انصاف کرنے لگا۔ میرے ساتھ ہی چوہدری کا ہاتھ بھی حرکت میں آ گیا۔

چوہدری نے پوچھا۔ "ملک صاحب! بندے نے زبان کھولی کہ نہیں؟"

بڑی دیر کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف آیا تھا۔ میں نے اسے خوش کرنے کے لئے کہا۔

"ابھی تو میں نے پیار کی زبان استعمال کی ہے اور میں محسوس کر رہا ہوں، یہ زبان اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ رات کو اسے حوالدار کے سپرد کروں گا۔ اُمید ہے، صبح تک وہ تیر کے مانند سیدھا ہو جائے گا اور بڑی خوشی سے حقیقت اُگل دے گا۔ ویسے....."

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا، پھر چوہدری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"ابھی تک تو وہ آپ پر ہی الزام لگا رہا ہے۔"



"کیا کہتا ہے، میرے بارے میں وہ بدبخت؟" چوہدری کے چہرے پر ناگواری اُبھر آئی۔

میں نے کہا۔

"اس کا دعویٰ ہے کہ نبیلہ کو آپ ہی نے کہیں غائب کروایا ہے اور اس پر الزام لگا کر اسے جیل بھجوانا چاہتے ہیں۔"

اس گفتگو کے دوران میں، میں بڑی توجہ سے چوہدری کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ انور کے لگائے گئے الزامات کا سن کر چوہدری کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی نفرت اُبھری، پھنکار سے مشابہ لہجے میں اس نے مجھ سے استفسار کیا۔

"ملک صاحب! اس گندے کیڑے نے یہ نہیں بتایا کہ میں ایسا کیوں کروں گا۔ میری اس سے کیا دشمنی ہے؟"

"بتایا ہے جناب!" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "اس کا کہنا ہے کہ وہ نبیلہ سے سچی محبت کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے، لیکن آپ کو یہ پسند نہیں ہے۔"

"کمال ہے۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے اور اُلٹا مجھ ہی سے پوچھنے لگا۔ "ملک صاحب! آپ ہی بتائیں، مجھے انور اور نبیلہ کی شادی پر بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

چوہدری کے اس استفسار سے واضح ہوتا تھا کہ وہ کسی بھی حوالے سے نبیلہ کی ذات میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ یہ ایک اہم اور حیران کن بات تھی۔ چوہدری ان لمحات میں اگر مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہیں کر رہا تھا تو پھر انور اور وحید راٹھور کے خدشات مبنی برحقیقت نظر آتے تھے۔ لیکن وہ نبیلہ سے شادی کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ اپنی مطلب براری کے لئے محض عائشہ کو سبز باغ دکھا رہا تھا۔ بہرحال، میں نے چوہدری کے استفسار کے جواب میں کہا۔

"انور کا دعویٰ ہے کہ آپ نبیلہ سے شادی کی خواہش رکھتے ہیں، لہٰذا اسے اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے ہیں اسی لئے آپ نے نبیلہ کو غائب کرا کے اسے پولیس کے چکر میں پھنسا دیا ہے۔"

"کتنا بے وقوف ہے یہ بھی۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔ "ملک صاحب! آپ ماشاء اللہ! سیانے آدمی ہیں۔ میرا اور انور کا کیا مقابلہ؟.....اگر مجھے نبیلہ سے شادی کرنا ہوتی تو کیا میں اس سے اجازت لیتا؟ وہ کون لگتا ہے، نبیلہ کا؟"

چوہدری کی آواز میں غصے کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اضافہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"ملک صاحب! فرض کریں، میں اگر واقعی نبیلہ سے شادی کا خواہش مند ہوتا تو پھر اسے غائب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟.....اور دوسری بات یہ کہ اوّل تو وہ اُلّو کا پٹھا کسی بھی درجے پر میرا ہم سر نہیں اور اگر ایسا ہوتا بھی تو میں نبیلہ کو غائب کرانے کے بجائے اس کا مکو ٹھپ دیتا۔ اپنی راہ کے کانٹے صاف کرنا مجھے بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس کا دماغ کیوں خراب ہو گیا ہے۔ مجھے اُمید ہے، جب رات کو آپ اسے تفتیش کی سختی سے گزاریں گے تو اس کا بخار فوراً اُتر جائے گا اور وہ آپ کو نبیلہ کے بارے میں سب کچھ سچ سچ بتا دے گا۔"

چوہدری نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے جتا دیا تھا کہ اس کا نبیلہ سے شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ یہی خیال اے ایس آئی وحید راٹھور کا بھی تھا۔ انور نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا تھا کہ چوہدری، عائشہ سے مسلسل جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ اسے شادی کا لارا دے کر نبیلہ کو اپنی عیاشی کے لئے مخصوص رکھنا چاہتا ہے۔ مگر عائشہ کو پورا یقین تھا کہ چوہدری اس کی بیٹی سے ضرور شادی کرے گا۔

میں اگر چاہتا تو یہاں عائشہ کو کوٹ کر سکتا تھا۔ چوہدری نے انور کو تو جھٹلا دیا تھا، ممکن ہے، وہ عائشہ کی خواہش کو بھی ایک دیوانگی سے تعبیر کرتا، لہٰذا میں نے چوہدری کو مزید گھسنے کے لئے اس پتے کو بچا لیا اور گہری سنجیدگی سے کہا۔

"چوہدری صاحب! اگر سچ پوچھیں تو مجھے انور کی بات کا بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ اب اس عمر میں جب آپ نانا اور دادا بن چکے ہیں، کیا شادی کریں گے۔ اور وہ بھی ایک معمولی سی لڑکی کے ساتھ۔ لیکن آپ کو تو پتہ ہے نا....." میں نے تھوڑا توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ جانتے ہیں، چوہدری صاحب! جب ہمارے پاس کوئی شکایت پہنچتی ہے



تو اس پر کارروائی لازم ہو جاتی ہے۔ بس، میں تو معمول کی پوچھ گچھ کے لئے اِدھر آ گیا تھا۔ حالانکہ اس نامراد نے آپ پر کسی اور حوالے سے بھی کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کی اور....."

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تشویش بھرے لہجے میں بولا۔

"مزید کیا بکواس کی ہے اُس کتے نے؟"

میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایک کاری ضرب لگائی۔

"وہ بڑے وثوق سے کہہ رہا ہے کہ آپ کے اور عائشہ کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں۔ اسی لئے عائشہ آپ کے دباؤ میں ہے اور وہ نبیلہ کی شادی آپ سے کرنے کو تیار ہے۔ وہ اپنے شوہر کی ذرا عزت نہیں کرتی۔ اُسے اُلّو کا گوشت کھلا کر گھر کے ایک کونے میں پھینک رکھا ہے۔ اس کے گھر کا سارا خرچہ آپ کی حویلی سے جاتا ہے، اسی لئے آپ کے دو ڈشکروں نے اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ اس کے خلاف ایک گہری سازش کر رہے ہیں۔"

"ملک صاحب!" وہ دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچتے ہوئے قہر ناک انداز میں بولا۔ "میں قانون کا بہت احترام کرتا ہوں۔ وہ اس وقت آپ کی تحویل میں ہے، اس لئے میں آپ کے معاملات میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا۔ اگر وہ تھانے سے باہر ہوتا تو یقین کریں، اس بکواس پر میں اس کی گردن مروڑ کے رکھ دیتا۔"

میں نے دل میں کہا۔ چوہدری صاحب! مجھے آپ کی طرف سے کسی ایسے ہی ردِعمل کی توقع تھی، جبھی تو انور کی حفاظت کے پیشِ نظر میں نے اسے تھانے میں بند کر رکھا ہے!

میں نے انور کی ذات سے منسوب کر کے جو بھی کہانی چوہدری کو سنائی تھی، اس کی اثر پذیری دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے اَن جانے میں کسی نے اس کی اَن دیکھی دُم پر پاؤں رکھ دیا ہو۔ وہ بری طرح بلبلا رہا تھا۔

میں خاموشی سے اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"ملک صاحب! دیکھا آپ نے، اس کم ذات نے بے چاری عائشہ پر کتنا گھناؤنا

الزام لگایا ہے۔ اس سے اس کی گندی سوچ کی عکاسی ہوتی ہے۔ ذرا سوچیں، اس کمینے کی بکواس کے مطابق، اگر مجھ میں اور عائشہ میں ایسا کوئی تعلق رہا ہوتا تو وہ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنے پر کیسے تیار ہو جاتی؟ وہ کم بخت آپ کو گمراہ کر رہا ہے ملک صاحب! جب کہ عائشہ کا معاملہ صرف اتنا ہے.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''عائشہ ایک طویل عرصے تک میری حویلی میں نوکرانی کے طور پر کام کرتی رہی ہے۔ اس کا گھر والا، حیات احمد ایک نمبر کا ہڈ حرام اور نکھٹو ہے۔ ظاہر ہے، عائشہ پورا دن میری حویلی میں جان مارتی رہی ہے تو اس کے گھر کا خرچہ بھی میرے ہی توسط سے چلتا رہا ہے.....بس، فرق اتنا سا ہے کہ میں نے اس سلسلے کو ابھی تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ عائشہ اب باقاعدہ حویلی میں کام کرنے نہیں آتی، لیکن میں ایک اچھی روایت کو ابھی تک نبھا رہا ہوں۔ ویسے بھی دریا میں سے اگر ایک قطرہ نکل جائے تو اس سے دریا کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اور پھر.....اگر میں عائشہ کے گھر کا خرچہ چلا بھی رہا ہوں تو اس ذلیل انسان کو کیا تکلیف ہے، ملک صاحب!'' اس نے سنسناتے ہوئے لہجے میں مجھے مخاطب کیا، پھر گمبھیر انداز میں بولا۔

''انور اس وقت آپ کی کسٹڈی میں ہے۔ میرے آدمیوں نے پکڑ کر اسے آپ کے حوالے کیا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے، نبیلہ کی گمشدگی میں اسی کا ہاتھ ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اگر آپ نبیلہ کو بازیاب کروانے کے بعد اُس خارش زدہ کتے کو جیل بھجواتے ہیں تو اچھی بات، ورنہ.....''

''ورنہ کیا، چوہدری صاحب؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''میں اس ناپاک جانور اور اس کے گھر والوں کو اپنے گاؤں میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر انور لمبے عرصے کے لئے جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں جاتا تو بشیر ترکھان کو یہ گاؤں چھوڑ کر اپنا ٹھکانہ کہیں اور کرنا ہوگا۔ میں اس گاؤں کا چوہدری ہونے کی حیثیت سے انہیں گاؤں بدر کر سکتا ہوں۔''

''آپ کو ایسا قدم اُٹھانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، چوہدری صاحب!''



میں نے اُسے لگام میں رکھنے کے لئے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''انور کی طرف سے آپ بالکل بے فکر ہو جائیں، میں اُسے ایسا فٹ کروں گا کہ اس کی آنے والی سات نسلیں بھی اس نوعیت کی بکواس کی جرأت نہیں کر سکیں گی۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے۔ کوئی بھی مجرم میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتا۔''

''مجھے آپ سے یہی امید ہے ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں قانون کو ہاتھ میں لینے کا حامی نہیں ہوں، اسی لئے میرے بندوں نے اس بدبخت کو پکڑ کر آپ کے حوالے کیا ہے۔ ورنہ میں اسے حویلی میں بلا کر اس کے سارے کس بل نکال سکتا تھا۔ مجھے آپ پر پورا بھروسہ ہے کہ آپ اس کا انجام بڑا عبرت ناک کریں گے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں، چوہدری صاحب!'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں انصاف کے تقاضے ضرور پورے کروں گا۔''

وہ مطمئن ہو گیا۔

میں نے اس سے گرم جوش مصافحہ کیا اور حویلی سے نکل آیا۔

واپسی کی مڑگشت میں بھی میرا ذہن پوری طرح بیدار اور فعال رہا اور تھانے پہنچنے سے پہلے ایک ایسا آئیڈیا میرے دماغ میں آ ہی گیا، جس پر عمل کر کے میں اس کیس کا ڈراپ سین چلا سکتا تھا اور وہ آئیڈیا تھا.....عائشہ پر خصوصی کام!

❁.....❁

میں نے تھانے میں قدم رکھا تو اے ایس آئی کو ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں اس وقت تھانے کے احاطے میں کھڑے تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو وحید راٹھور نے با آوازِ بلند کہا۔

''لیں، انچارج صاحب بھی آ گئے۔''

یہ جملہ یقیناً اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو سنانے کے لئے ادا کیا تھا۔ وہ اُمید بھری نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس دوران میں، میں ان کے قریب پہنچ گیا۔ اے ایس آئی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ وہ گویا اس شخص کا تعارف کروا رہا تھا۔

"ملک صاحب! یہ بشیر ترکھان ہے۔ اپنے بیٹے انور سے ملنے تھانے آیا تھا۔ میں نے حوالاتی سے اس کی ملاقات کرادی ہے اور اب یہ واپس جا رہا ہے۔"

میں نے چوہدری کی حویلی کا رخ کرنے سے پہلے وحید راٹھور کو خصوصی ہدایات دے دی تھیں کہ اسے میری غیر موجودگی میں تھانے کا نظام کس طرح سنبھالنا ہے۔ انہی ہدایات میں بشیر ترکھان کے حوالے سے بھی چند اہم باتیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ وحید نے بشیر ترکھان کو اطمینان بخش طریقے سے ڈیل کیا ہوگا۔

وحید نے میرا تعارف کرایا تو بشیر ترکھان مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولا۔

"تھانیدار جی! میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، میرا بیٹا اغوا جیسے جرم میں ملوث نہیں ہوسکتا۔ یہ تو کل دوپہر کو اپنی ماسی سے ملنے دوسرے پنڈ گیا ہوا تھا۔ اگر اس دوران میں عائشہ کی بیٹی غائب ہوئی ہے تو اس میں میرے انور کا کوئی ہاتھ نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے، انور کو پھنسانے کے لئے کوئی گہری سازش کی جا رہی ہے۔"

"بشیر!" میں نے اس کے خاموش ہونے پر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تمہیں چھوٹی یا بڑی، کوئی بھی قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔ میں سنی سنائی باتوں پر یقین نہیں کرتا، بلکہ میں اپنے طور پر تحقیق اور تفتیش کرتا ہوں۔ اگر تمہارا بیٹا بے قصور ہے تو یقین کرو، اس کا ایک بال بھی بانکا نہیں ہوگا۔ بس، ایک رات کی بات ہے۔ کل تک میری تفتیش مکمل ہو جائے گی۔ اگر انور نے نبیلہ کو اغوا کر کے کہیں نہیں چھپایا تو سمجھو کہ کل کی رات یہ اپنے گھر میں سوئے گا۔ اور اگر..... یہ اس معاملے میں ملوث ہے تو پھر اسے کوئی بھی قرار واقعی سزا سے نہیں بچا سکے گا۔" میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے تمہارے بیٹے کو معمول کی پوچھ گچھ کے لئے روکا ہوا ہے، تم بے فکر ہو کر گھر جاؤ۔ اللہ بھلا کرے گا۔"

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور وہ مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

میں وحید راٹھور کے ساتھ اپنے کمرے میں آ بیٹھا۔ وحید نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔ "ملک صاحب! اِدھر چوہدری کی حویلی میں کیا رہا؟"



میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے وہاں ہونے والی گفتگو سے آگاہ کر دیا۔

اس نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور میرے خاموش ہونے پر پوچھا۔

"اب آپ کا کیا ارادہ ہے، ملک صاحب؟"

"ارادہ تو میرا نیک ہی ہے۔" میں نے کہا۔ "تم فوراً جاؤ اور نبیلہ کی ماں عائشہ کو اپنے ساتھ تھانے لے آؤ..... اور ہاں، یہ کوشش کرنا کہ وہ اکیلی ہی آئے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی، بالکل سمجھ رہا ہوں۔" وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کوئی خاص قسم کا ٹرائل کرنے والے ہیں۔"

"وحید! جو کچھ بھی ہوگا، تمہاری نظر کے سامنے ہی ہوگا۔" میں نے ذومعنی انداز میں کہا۔ "تم وقت ضائع نہ کرو اور فوراً عائشہ کے گھر کی جانب روانہ ہو جاؤ۔"

"اوکے، سر!" وہ ایک جھٹکے سے اُٹھا اور کمرے سے نکل گیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ عائشہ کو اپنے ساتھ لے کر واپس آ گیا۔ پتہ نہیں، اس نے نبیلہ کی ماں کو کیا راگ دیا تھا کہ وہ خاصی مطمئن دکھائی دیتی تھی۔ میں نے عائشہ کو اپنے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھنے کو کہا۔ وحید راٹھور بھی ایک کرسی کھینچ کر تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گیا۔

عائشہ نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ملک صاحب! اس نامراد نے کیا بتایا ہے، میری بیٹی کے بارے میں؟" اس کا اشارہ انور علی کی طرف تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

"عائشہ! میں نے تمہیں یہ بتانے کے لئے تھانے بلایا ہے کہ انور نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔"

"جی.....!" وہ ہکا بکا رہ گئی۔ اُس کے ایک لفظی جملے میں دنیا جہان کی حیرت بھری ہوئی تھی۔ یہ اس کا ایک بے ساختہ عمل تھا، جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں بہت دور تک جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں..... کیا میری بات کا تمہیں یقین نہیں آیا؟"

"نن.....نہیں جی.....ایسی بات نہیں۔" وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔ "آپ کہہ رہے ہیں تو ایسا ہی ہوگا.....کیا بتاتا ہے وہ نبیلہ کے بارے میں؟.....میری بچی کس حال میں ہے؟ اور.....کہاں ہے؟.....آپ نے اس سے پوچھا تو ہوگا۔"

میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

"عائشہ بی بی! تم میری بات کو بالکل غلط سمجھتی ہو۔ میں نبیلہ کے بارے میں نہیں کہہ رہا تھا۔"

"پھر.....؟" اُس کی حیرت دوچند ہوگئی۔ "پھر اس شیطان نے کس جرم کا اقرار کیا ہے؟"

"جرمِ محبت۔" میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"کیا؟" وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھنے لگی۔

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"عائشہ بی بی! انور نے اس حقیقت کا اعتراف کر لیا ہے کہ وہ تمہاری بیٹی سے سچی محبت کرتا ہے۔ اور اسی جرمِ محبت کی پاداش میں چوہدری اسے فٹ کرانا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی نبیلہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔"

"یہ بکواس تو کسی کام کی نہ ہوئی، تھانیدار جی!" وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولی۔ "میں تو یہ سمجھی تھی کہ اس نے نبیلہ کو اغوا کرنے کا جرم قبول کر لیا ہے۔"

"عائشہ! تم سیانی بیانی ہو۔" میں نے آگے کو جھک کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "نبیلہ کو اغوا کرنے کا اقرار وہ کیسے کر سکتا ہے، جبکہ اس نے یہ جرم کیا ہی نہیں۔"

"آپ بھی اسی بدبخت کی طرف داری کر رہے ہیں، تھانیدار جی!" وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔ "مجھے آپ سے یہ اُمید نہیں تھی۔"

"ناراض نہ ہو، عائشہ بی بی!" میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انور نے نبیلہ کو اغوا کیا ہے یا نہیں، سزا تو اسے ہر صورت ملے گی۔ میں اسے جیل کی سلاخوں کے پیچھے بھیج کر ہی دم لوں گا۔"

اس نے خوشی بھری حیرت سے مجھے دیکھا اور بولی۔

"پتہ نہیں، آپ کس قسم کی اُلجھی ہوئی باتیں کر رہے ہیں.....میری تو کچھ سمجھ



میں نہیں آ رہا۔"

"تم اپنے ذہن اور سمجھ کو نہ تھکاؤ۔ میری بات میں کوئی اُلجھن نہیں ہے، عائشہ!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میری چوہدری صاحب سے بات ہوگئی ہے۔ میں ابھی ابھی ان کی حویلی ہی سے آ رہا ہوں۔ سمجھو کہ نبیلہ کے حوالے سے اب بھی میں تم لوگوں کے راز میں شریک ہوں۔ چوہدری مشتاق نے اعتماد میں لے کر مجھے سب کچھ بتا دیا ہے، بلکہ میں تو نبیلہ سے....."

میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ تڑپ کر رہ گئی۔ اضطراری لہجے میں اس نے مجھ سے پوچھا۔

"آپ نبیلہ سے کہاں مل کر آ رہے ہیں؟"

اس کے ایک اضطراری جملے نے ہاتھ پکڑ کر مجھے میرے مقصد تک پہنچا دیا۔ میں نے ایک گہری سکون بخش سانس خارج کی۔ میں نے اپنے نامکمل جملے میں قطعاً ایسا کوئی تاثر نہیں دیا تھا کہ میں نبیلہ سے مل کر آ رہا ہوں۔ لیکن میری اس سیدھی اور سادہ سی چال نے اس کی زبان کو حقیقت حال کے اظہار پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ خدشہ یا اندازہ سچ ثابت ہو رہا تھا کہ نبیلہ کو چوہدری مشتاق اور عائشہ نے ملی بھگت سے کہیں غائب کیا تھا۔ میں نے اس کے اضطرابی استفسار کے جواب میں بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا.....عائشہ! تم سیانی بیانی ہو.....اور یہ بھی بتایا ہے کہ نبیلہ والے معاملے پر میری چوہدری مشتاق سے تفصیلی گفتگو ہوئی ہے۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ نبیلہ کو ڈیرے پر چھپایا گیا ہے۔ میں ابھی چوہدری کے ڈیرے ہی پر نبیلہ سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ بھلی چنگی اور خوش باش ہے۔ چوہدری صاحب نے بتایا ہے کہ جب میں انور کو جیل بھجوا دوں گا تو نبیلہ کو منظرِ عام پر لایا جائے گا۔ اب تو تمہیں یقین آ گیا نا، میں تم دونوں کے راز میں شریک ہو چکا ہوں؟"

"یقین تو آ گیا ہے جی، پر میرے دل میں ایک بات چبھ رہی ہے۔" وہ اے ایس آئی کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ "بالکل کسی کانٹے کی طرح جی۔"

"یہ اے ایس آئی وحید راٹھور ہے، میرے مکمل بھروسے کا آدمی۔" میں نے عائشہ کی پریشانی دور کرتے ہوئے کہا۔ "تم بے دھڑک بتاؤ، کون سی بات تمہارے دل

میں کھٹک رہی ہے؟''

وحید راٹھور ہماری گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ اس سچویشن کو انجوائے کر رہا تھا۔ عائشہ متذبذب انداز میں بولی۔

''تھانیدار جی! آپ ابھی نبیلہ سے مل کر آ رہے ہیں تو ظاہر ہے، جھوٹ نہیں بول رہے ہوں گے۔ مگر چوہدری صاحب نے مجھ سے کیوں غلط بیانی کی؟''

''کیسی غلط بیانی، عائشہ؟'' میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے بتایا۔

''چوہدری صاحب نے تو مجھے بتایا تھا کہ وہ نبیلہ کو بے ہوش کرنے کے بعد دارا مُرکی والا کے ساتھ بھرت پور بھیج دیں گے۔ دارا اسے وہاں اپنے بندوں کے پاس چھوڑ کر واپس یہاں آ جائے گا۔ بھرت پور والے بندے بھی دراصل چوہدری صاحب ہی کے نمک خوار ہیں۔ پروگرام یہ طے ہوا تھا کہ انور کے جیل جانے کے بعد جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو نبیلہ کو یہاں لے آئیں گے۔ لیکن آپ بتا رہے ہیں کہ.....''

''میں نے کہا ہے نا، تم اپنے جی کو نہ اُلجھاؤ۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''نبیلہ بھرت پور میں ہے یا یہاں والے چوہدری کے ڈیرے پر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بہت جلد وہ تمہارے سامنے ہو گی اور اس وقت تک تم سرکاری مہمان کی حیثیت سے میرے پاس رہو گی۔''

میرا آخری جملہ سن کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا، وہ بے حد مضطرب انداز میں بولی۔

''جی.....کیا مطلب ہے آپ کا؟''

''مطلب بڑا واضح ہے، عائشہ!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا۔ ''جب تک میں بھرت پور سے تمہاری بیٹی کو بازیاب کر کے یہاں نہیں آتا، تمہیں میرے تھانے کی حوالات میں رہنا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم آزاد گھومو.....اور چوہدری مشتاق سے جا کر اس بات کی تصدیق کرو کہ اس نے مجھے نبیلہ والے راز میں شریک کیا ہے یا نہیں۔''

''تو کیا.....تو کیا.....؟'' اُس کی آنکھوں میں دہشت سی بھر گئی۔



میں نے کڑک کر کہا۔ ''تو کچھ نہیں.....تو کچھ نہیں.....!''

''ابھی آپ نے بتایا ہے کہ ڈیرے پر نبیلہ سے مل کر آ رہے ہیں۔'' اُس کی حالت دیدنی تھی۔ ''پھر.....اُسے لینے کے لئے بھرت پور کیوں جا.....؟''

وہ بولتے بولتے یک دم خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں مجھے موت کے سائے لہراتے دکھائی دیئے۔ اُسے یقین ہو گیا کہ میں نے ایک سیدھی چال چل کر اُسے بڑا اُلٹا پھنسا دیا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہائے دوائے شروع کرتی، میں نے حوالدار بہادر علی کو بلا کر اُسے حوالات میں بند کرا دیا۔ پھر وحید راٹھور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''کہو، کیسا رہا.....میرا آئیڈیا پسند آیا؟''

''سپر سر! سپر۔'' وہ سراہنے والے انداز میں بولا۔ ''آپ نے تو کمال کر دیا۔''

''اب تھوڑا بہت کمال اور جلال تمہیں بھی دکھانا ہے وحید!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

وہ سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''حکم ملک صاحب!''

میں نے کہا۔

''بھرت پور یہاں سے صرف دو میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ میں نبیلہ کو بازیاب کرنے اُدھر جا رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے، رات کا اندھیرا پھیلنے سے پہلے ہی میں کامیاب لوٹ آؤں گا۔ اس دوران تمہیں جواں مردی کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ چوہدری کو عائشہ کی حراست کا علم ہو جائے۔ وہ خود یا اپنے کسی ڈشکرے کو تھانے بھیج سکتا ہے تاکہ صورتِ حال سے آگاہی حاصل کر سکے۔ تم نے کسی بھی شخص کو عائشہ تک نہیں پہنچنے دینا، ورنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا۔''

میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''عائشہ کی حمایت میں آنے والا کوئی بھی شخص اگر زیادہ اکڑفوں دکھانے کی کوشش کرے تو ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے پکڑ کر حوالات میں بند کر دینا، چاہے وہ چوہدری مشتاق ہی کیوں نہ ہو۔ میری طرف سے تمہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں۔''

وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔

"آپ نے اختیارات دیئے ہیں تو سمجھیں، میں شیر بن گیا ہوں۔ اب چوہدری ہو یا اس کا کوئی پالتو جانور..... اگر اس نے میرے منہ لگنے کی جرأت کی تو میں اسے چیر پھاڑ کر کھا جاؤں گا۔"

"شاباش!" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔ "برائی اور باطل کے خلاف ایک پولیس اہلکار کو ایسا ہی پُرعزم اور فرض شناس ہونا چاہئے۔ میں تھانے کے عملے کو خصوصی ہدایات دے کر جاؤں گا۔ اس کارِ خیر میں وہ تم سے مکمل تعاون کریں گے۔"

"بہت بہت شکریہ، ملک صاحب!" وہ بھرّائی ہوئی آواز میں بولا، پھر پوچھا۔

"کیا آپ بھرت پور اکیلے ہی جائیں گے؟"

"میں اپنے ساتھ کانسٹیبل گل فراز کو لے کر جا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"بھرت پور ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، وہاں چوہدری مشتاق کے نمک خواروں کو تلاش کرنا اور ان کے قبضے سے نبیلہ کو نکالنا میرے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ سمجھو، میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔ یہ اتنا بڑا مشن نہیں کہ میں اپنے ساتھ پوری بٹالین لے کر چلوں۔"

وحید نے زیرِلب مسکراتے ہوئے اثبات میں گردن ہلا دی۔

❁.....❁

اُس روز میں سورج غروب ہونے سے پہلے ہی کامیاب واپس لوٹ آیا۔ انسان کا عزم مضبوط اور حوصلہ جوان ہو تو وہ پہاڑ کاٹ کر بھی اپنے لئے راستہ بنا سکتا ہے۔ میں نے نہ صرف نبیلہ کو بازیاب کرا لیا تھا، بلکہ بھرت پور سے چوہدری مشتاق کے تین بندوں کو بھی گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے آیا تھا۔

جب میں نے تھانے میں قدم رکھا تو ایک سنسنی خیز صورتِ حال میری منتظر تھی۔ چوہدری مشتاق اپنے حواریوں کے ہمراہ بہ نفسِ غلیظ تھانے میں موجود تھا اور عائشہ کی رہائی کے لئے وحید راٹھور سے گرما گرمی کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو اس کا غصہ ساتویں آسمان کو چھونے لگا، برہمی سے بولا۔

"صفدر حیات! تم نے مجھ سے بڑا خطرناک دھوکا کیا ہے۔ یاد رکھو، اس حرکت کا بڑا بھیانک نتیجہ برآمد ہوگا۔"

"حرکت میں برکت ہے، چوہدری مشتاق! اور خاصی صحت مند "برکت" ہے۔"



میں نے نبیلہ اور اس کے، بھرت پور سے گرفتار ہونے والے بندوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور جہاں تک دھوکا دینے کا تعلق ہے تو بلف گیم (دھوکا دہی کے کھیل) میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو، تم نے کتنی رتی سچ اور کتنے ٹن جھوٹ بولا ہے مجھ سے اور..... تم جو بھیانک نتیجے کا ذکر کر رہے ہو نا....."

میں نے ڈرامائی توقف کیا، پھر سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ نتیجہ تو واقعی بڑا بھیانک نکلنے والا ہے۔ لیکن میرے لئے نہیں بلکہ تمہارے لئے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بڑی بدتمیزی سے مستفسر ہوا۔

میں نے وحید راٹھور کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"راٹھور صاحب! چوہدری مشتاق کو آسان زبان میں میری بات کا مطلب سمجھا دو۔ میں سمجھانے بیٹھ گیا تو اس کے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

اے ایس آئی خطرناک انداز میں چوہدری کی جانب بڑھا تو وہ چلّا اٹھا۔

"یہ..... یہ کیا بے ہودگی ہے؟"

"یہ بے ہودگی نہیں، گرفتاری ہے چوہدری صاحب!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں نبیلہ کو اغوا کرانے اور حبسِ بے جا میں رکھوانے کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔ اب تمہاری باقی کی، ابتدائی زندگی میرے تھانے کی حوالات میں اور آخری زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزرے گی۔"

"تم..... تم..... ایسا نہیں کر سکتے۔" وہ بھڑک کر بولا اور اس کے ساتھ ہی باہر کی جانب دوڑ لگانے کی کوشش کی۔

مجھے اس سے ایسی کسی بھی حرکت کی توقع تھی۔ میں نے بڑی پھرتی سے اس کی ٹانگوں میں اڑنگا لگایا۔ وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ، منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ اس ٹکراؤ نے اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ برآمد کی اور وہ بلبلاہٹ بھرے انداز میں مجھے غلیظ گالیوں اور خطرناک دھمکیوں میں تولنے لگا۔

میں نے اس کی یاوہ گوئی اور لن ترانیوں کی ذرا پروا نہیں کی اور اس کے ساتھیوں سمیت گرفتار کر کے اپنے تھانے کی حوالات میں بھر دیا۔ حوالات اس "شکم سیری" پر

بڑی خوش نظر آتی تھی۔ ''پیٹ'' بھرنے کے لئے کھانا تو اسے ملتا ہی رہتا تھا، لیکن چوہدری مشتاق کے وجود نے گویا اس کے لئے ''شاہی ضیافت'' کا اہتمام کر دیا تھا۔

چوہدری مشتاق کو قرار واقعی سزا دلوانے کے لئے میرے پاس نبیلہ کی شکل میں ایک مضبوط گواہ موجود تھی۔ وہ چوہدری سے جتنی شدید نفرت کرتی تھی، اتنا ہی ٹوٹ کر وہ انور کو چاہتی تھی۔ اس محبت کی قوت نے اس کے اندر ایسا حوصلہ پیدا کیا کہ وہ حالات کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔ چوہدری نے مختلف ذرائع سے اسے خطرناک دھمکیاں دیں، لیکن اس کے پایۂ استقامت میں کوئی لرزش نہ آئی۔

نبیلہ کے استقلال اور تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال کو دیکھ کر عائشہ بھی چوہدری کے خلاف ہو گئی اور اس نے اس بکھیڑے کا سارا الزام چوہدری مشتاق پر ہی ڈال دیا۔ اس نے اپنے حلفیہ بیان میں بتایا کہ وہ چوہدری کے دباؤ کے سبب مجبور ہو گئی تھی۔

عائشہ وعدہ معاف گواہ بنی تو میرا کام اور بھی آسان ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی نبیلہ اور انور کا ''کام'' بھی سہل ہو گیا۔ ان کی سچی محبت رنگ لے آئی۔ اِدھر میں نے چوہدری مشتاق کو عدالت سے سزا دلوا کر جیل بھجوایا، اُدھر نبیلہ اور انور کی شادی ہو گئی۔

ایسا نہیں ہے کہ چوہدری مشتاق نے اپنی طاقت اور تعلقات کا استعمال نہیں کیا تھا۔ اس نے سزا سے بچنے کے لئے سرتا پا زور مارا تھا، لیکن اس کے مدِ مقابل کوئی عام تھانیدار نہیں، بلکہ ملک صفدر حیات تھا..... میں نے اس کی ہر چال اسی پر لوٹا کر نبیلہ سے کیا ہوا وعدہ نبھا دیا۔

بعض اوقات چہل قدمی کرتے ہوئے ایسے ہی انمول آئیڈیاز ذہن میں آ جاتے ہیں، جیسا کہ میرے ذہن میں وارد ہوا تھا۔ میں نے عائشہ کی زبان کھلوانے کے لئے ایک سیدھی چال چلی، جو نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔

نہ صرف نتیجہ خیز ثابت ہوئی، بلکہ اس نے بہت سوں کی زندگی میں بہار، نکھار اور سدھار پیدا کر دیا تھا۔

❁.....❁



# ضمیر فروش

کہا جاتا ہے، چہرہ دل کی کتاب ہے!

یقیناً چہرہ دل کی کتاب ہے۔ لیکن اس کو پڑھنے کے لئے بڑی دور بین نگاہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بصارت کے ساتھ ساتھ بصیرت کو بھی استعمال کرنا پڑتا ہے، ورنہ بعض چہرے اتنی خوب صورتی سے دھوکا دیتے ہیں کہ پلٹ کر پچھتانے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ ایسی ہی صورتوں کے لئے بزرگ حضرات کہہ گئے ہیں..... شکل مومناں، کرتوت کافراں!

زیرِ نظر کہانی بھی ایک ایسے ہی کردار کی ہے، جس نے خبث باطن کو معزز صورت کی آڑ میں چھپا رکھا تھا۔ دیہات کے سادہ لوح افراد اس کی وضع قطع اور ظاہری حلیے کو دیکھ کر فوراً متاثر ہو جاتے تھے، لہٰذا اس عیار شخص کو ''اپنا کام'' کرنے میں ذرا سی بھی دشواری محسوس نہ ہوتی۔ وہ انسان نہیں، انسان نما تھا اور اس کی کھال کے اندر چھپا ہوا حیوان ہر لمحے انسانوں کو کھانے کے لئے بے چین رہتا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ اس نے میرے تھانے کی حدود میں واقع ایک گاؤں کو مطلب براری کے لئے چن لیا تھا۔

ان دنوں میں ضلع جھنگ کے ایک قصبے ''نور کوٹ'' میں تعینات تھا۔ نور کوٹ کے آس پاس پائے جانے والے دیہات نذیر آباد، کسووال، بخت نگر، احمد پور اور چک چونتیس گ۔ب میرے ہی تھانے کی حدود میں شامل تھے۔ نور کوٹ میں لگ بھگ دو سو گھر آباد تھے اور یہ قصبہ ایک نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا۔

ایک روز میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھانے داری کر رہا تھا۔ وہ اپریل کا مہینہ تھا۔

اس سال موسمِ گرما بڑی جلدی میں دکھائی دیتا تھا۔ اپریل کی دھوپ میں ایسی تیزی اور حدت محسوس ہوتی تھی، جیسے جون اپنے جوبن پر ہو۔ میں ایک خاندان کے جھگڑے کو نمٹا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ حوالدار جمعہ خان میرے پاس آ گیا۔

جمعہ خان کی عمر پینتیس سے متجاوز تھی۔ وہ ایک مستعد اور ہوشیار قسم کا حوالدار تھا اور اسے اس تھانے میں خدمات انجام دیتے ہوئے لگ بھگ دس سال ہو گئے تھے۔ جب سے میں وہاں موجود تھا، میں نے اسے قابلِ اعتماد اور تجربہ کار اہل کار پایا تھا۔ وہ میرے سامنے ایک کرسی پر بیٹھنے کے بعد قدرے افسردہ لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! پتہ نہیں، ہمارے قصبے کی مسجد کا تنازع کب ختم ہو گا؟''

قصبہ نورکوٹ کے وسط میں ایک مسجد واقع تھی اور پچھلے کچھ عرصے سے وہاں ایک حساس نوعیت کا جھگڑا چل رہا تھا اور یہ ایک ایسا معاملہ تھا کہ پولیس کسی کی طرف داری کر کے کسی دوسرے کے خلاف کوئی انتہائی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ دراصل دو بڑے مسالک کے درمیان ٹھن گئی تھی۔ ایک مسلک کے ماننے والے اس مسجد کو خود سے منسوب کرنا چاہتے تھے اور دوسرے مسلک کے پیروکاروں کا خیال یہ تھا کہ اس مسجد پر ان کا حق زیادہ ہے۔ ظاہر ہے دونوں مسالک سے تعلق رکھنے والے بنیادی طور پر مسلمان تھے لیکن ''حسبِ توفیق'' وہ دوسرے کے خلاف اتنا بڑھ چڑھ کر بول رہے تھے کہ مسجد کا مستقبل داؤ پر لگ گیا تھا۔

قصبے میں دونوں مسالک سے تعلق رکھنے والوں کی ملی جلی آبادی تھی، لہٰذا مسجد کے ساتھ ساتھ نمازی بھی سخت پریشانی میں تھے۔ حالانکہ اس تنازع سے قبل تمام لوگ بلا تفریق ایک ہی جگہ پر نماز ادا کیا کرتے تھے۔

میں نے حوالدار کی پریشانی کے جواب میں کہا۔

''جمعہ خان! مسجد دراصل اللہ کا گھر ہے، جو کہ اس کی عبادت کے لئے تعمیر کیا جاتا ہے۔ لیکن ہم لوگوں نے فرقوں اور مسلکوں میں بٹ کر اپنی مساجد الگ کر لی ہیں، اپنی نماز اور دیگر عبادات کے طور طریقے ایک دوسرے سے جدا کر لئے ہیں۔ حالانکہ سب خود کو مسلمان کہتے ہیں اور یہ بھی دعویٰ ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ جب خدا ایک ہے اور سبھی اس کی عبادت کرتے ہیں تو پھر یہ مسجد ہماری، وہ مسجد تمہاری، کی کیا



توضیح ہے؟ بہرحال.....''

میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''یہ مذہب اور مسلک کا تنازع ہے۔ دونوں مسالک کے مذہبی رہنماؤں کو مل بیٹھ کر اس مسئلے کو حل کرنا چاہئے۔ پولیس اس سلسلے میں براہِ راست کوئی کارروائی نہیں کر سکتی۔ ہاں البتہ اگر یہ تنازع کسی مرحلے پر قابلِ دخل اندازی پولیس ٹھہرا تو پھر دیکھا جائے گا۔''

''ہوں.....!'' حوالدار نے تھکے ہوئے انداز میں کہا۔ ''میری تو خدا سے یہی دعا ہے کہ وہ ہمارے قصبے میں بھی کسی حاجی برکت علی رحمت علی کو بھیج دے۔ شاید اس طرح یہ مسئلہ حل ہو جائے۔''

میں نے چونک کر جمعہ خان کی طرف دیکھا۔ اس کے منہ سے حاجی برکت علی رحمت علی کا نام سن کر میں مضطرب ہو گیا تھا۔ ان ناموں کا ذکر میں نے چند روز پہلے بھی کسی کی زبان پر سنا تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوا تھا۔ اب جو حوالدار نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں حاجی برکت علی رحمت علی کہا تو میرے اندر جاننے کا تجسس جاگ اُٹھا۔ میں نے میز پر کہنیاں ٹکائیں اور تھوڑا سا آگے کو جھکتے ہوئے استفسار کیا۔

''جمعہ خان! تم حاجی برکت علی رحمت علی وغیرہ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟ یہ کون لوگ ہیں اور کہاں سے آئے ہیں؟''

اس نے اُلجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھا اور بتایا۔

''جناب! یہ کوئی دو لوگ نہیں ہیں بلکہ ایک ہی شخص کا نام ہے۔ اور سنا ہے حاجی برکت علی رحمت علی لاہور سے آیا ہے۔''

جمعہ خان کی وضاحت نے مجھے اُلجھا دیا، میں نے کہا۔

''حوالدار صاحب! برکت علی، رحمت علی دو الگ الگ نام ہیں، جو کسی ایک شخص کے ہو نہیں سکتے۔ تم مجھے اس بارے میں تفصیل سے بتاؤ۔''

اس نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔

''ملک صاحب! یہ تو آپ کو پتہ ہی ہے کہ حاجی برکت علی رحمت علی پچھلے کچھ عرصے سے ادھر موضع بخت نگر میں آیا ہوا ہے۔ اس نے لوگوں کو یہی بتایا ہے کہ اس کا تعلق لاہور کے کسی علاقے سے ہے۔ میرا سالا شمشاد، بخت نگر میں رہتا ہے، اسی کی زبانی مجھے حاجی برکت علی رحمت علی کے بارے میں معلومات ملی ہیں اور اس کا کہنا ہے کہ حاجی صاحب دراصل ایک ہی شخص ہے لیکن اس کا نام کچھ ایسا ہے کہ لگتا ہے کہ یہ دو افراد ہیں۔''

میں نے حاجی برکت علی رحمت علی کے بارے میں اڑتی اڑتی جو خبریں سنی تھیں وہ کچھ اس طرح سے تھیں کہ وہ موضع بخت نگر میں اچانک ہی نمودار ہوا تھا اور بہت ہی قلیل مدت میں اس نے گاؤں والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ بڑا مہربان اور خدا ترس تھا۔ غریبوں اور ضرورت مندوں کی، اپنی جیب سے مدد کیا کرتا۔ لوگ اس کی انہی نیکیوں کے باعث اس سے متاثر ہوتے جا رہے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتا چلا جا رہا تھا۔

گاؤں دیہات اور وہاں بسنے والے لوگوں کا اپنا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے اور وہ اتنی آسانی سے نہیں بدلا کرتا۔ لوگ نسل در نسل ایک ہی جگہ پر رہتے چلے آ رہے ہوتے ہیں، لہٰذا وہ کسی نئے شخص کو اتنی آسانی سے قبول نہیں کرتے، متاثر ہونا تو بہت دُور کی بات ہے۔

اسی لئے حاجی برکت علی رحمت علی سے متعلق مشہور ہونے والی کہانیاں مجھے ہضم نہیں ہو رہی تھیں اور اب تو حوالدار جمعہ خان بھی ان معاملات کی تصدیق کر رہا تھا۔ موجودہ حالات چونکہ خلافِ معمول اور خلافِ دستور نظر آتے تھے، اس لئے میں اس حوالے سے خاصا غیر مطمئن تھا۔ میں پچھلے کئی دنوں سے اس پُراسرار کردار حاجی برکت علی رحمت علی کی اصلیت کھوجنے کا پروگرام بنا رہا تھا، لیکن بہ وجوہ میں اس جانب بھرپور توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اب جو جمعہ خان نے خود ہی ذکر چھیڑ دیا تو میں نے فیصلہ کر لیا کہ پہلی فرصت میں اس اسرار کو بھی حل کر ہی دینا چاہئے۔ میں نے حوالدار کی وضاحت کے جواب میں پوچھا۔

''جمعہ خان! کیا تم نے حاجی برکت علی رحمت علی کو دیکھا ہے؟''



''نہیں جناب!'' اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔ ''میں تو کافی عرصے سے بخت نگر نہیں گیا۔ پچھلی بار بھی زلیخا بچوں کو اپنے ساتھ لے کر خود ہی بھائی بہن اور ماں باپ سے ملنے چلی گئی تھی۔ حاجی صاحب کے بارے میں ساری معلومات مجھے شمشاد نے فراہم کی ہیں۔ وہ زلیخا اور بچوں کو چھوڑنے آیا تھا تو اس سے اس موضوع پر میری تفصیلی بات ہوئی تھی۔

میں جمعہ خان اور اس کی فیملی کے بارے میں چیدہ چیدہ باتوں سے واقف تھا۔ بخت نگر میں اس کی سسرال تھی۔ اس کے ساس سسر بہ قیدِ حیات تھے۔ زلیخا اس کی بیوی کا نام تھا، زلیخا کی مزید تین بہنیں ناہید، زبیدہ اور سلطانہ تھیں، جن کی ابھی تک شادیاں نہیں ہوئی تھیں۔ دو بھائی شمشاد احمد اور ارشاد احمد تھے جن میں سے صرف شمشاد شادی شدہ تھا۔ شمشاد اپنی بیوی بلقیس اور تین بچوں کے ساتھ والدین کے ہمراہ ہی رہتا تھا۔ حوالدار جمعہ خان کے چار بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور دو لڑکے۔ موضع بخت نگر، میرے تھانے سے لگ بھگ تین میل شمال میں واقع تھا۔ یہ نسبتاً ایک چھوٹا گاؤں تھا، جہاں سو، سوا سو گھر آباد تھے۔ یہ ساری تفصیل بتانے کا ایک مقصد ہے، وہ یہ کہ آپ کا ذہن اس ماحول اور فضا سے آشنا ہو جائے، جہاں سے متعلق یہ کہانی بیان کی جا رہی ہے، تاکہ مطالعے کے دوران آپ کا ذہن کسی مرحلے پر اُلجھن کا شکار نہ ہو۔

جمعہ خان کی بات مکمل ہونے پر میں نے استفسار کیا۔

''جمعہ خان! تھوڑی دیر پہلے ہمارے درمیان نور کوٹ کی مسجد کے تنازع والی صورتِ حال پر گفتگو ہو رہی تھی اور تم نے بڑی اُمید اور تمنا سے یہ دعا کی تھی کہ کاش! خدا ہمارے قصبے میں بھی کسی حاجی برکت علی رحمت علی کو بھیج دے.....!'' میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس حاجی برکت علی رحمت علی کا مسجد یا مولویوں کے تنازع سے کیا تعلق؟''

''مسجد یا مولوی وغیرہ سے تو اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔'' جمعہ خان نے جواب دیا۔ ''مگر مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ بڑا اللہ والا ہے۔ اللہ کی راہ میں دل اور ہاتھ کھول کر خرچ کرتا ہے۔ ادھر بخت نگر میں ایک چھوٹی سی کچی مسجد تھی۔ حاجی صاحب نے مولوی جی کو خاصی تگڑی رقم دی ہے تاکہ وہ مسجد کی تعمیر و توسیع کے لئے خرچ کر سکیں۔ میں

نے جو یہاں کے تنازع کے حوالے سے بات کی ہے نا.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک سکون بھری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''میرا یہ خیال ہے ملک صاحب! کہ اگر حاجی برکت علی رحمت علی کو یہاں کی مسجد میں جنم لینے والے جھگڑے کا پتہ چل جائے تو وہ ضرور اس مسئلے کو حل کر دے گا۔''

''لیکن کیسے؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ذرا وضاحت کرو۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''حاجی برکت علی رحمت علی اس تنازع کو اس طرح ختم کر سکتا ہے کہ وہ دونوں دھڑوں کے مولویوں سے ایک ملاقات کرے اور ان سے کہے کہ موجودہ مسجد پر کوئی ایک مسلک قبضہ کر لے، دوسرے مسلک والے اپنی پسند سے ایک اور مسجد تعمیر کر لیں اور اس مسجد کی تعمیر وغیرہ پر جو رقم خرچ ہوگی، وہ حاجی صاحب دیں گے۔''

''جمعہ خان! میں تمہارے خیال سے بالکل اتفاق نہیں کر سکتا۔'' اس کے خاموش ہونے پر میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے، یہ حاجی موضع بخت نگر میں رہتے ہوئے یہاں کے کسی معاملے میں ہاتھ نہیں ڈالے گا۔''

''کیوں جناب؟'' حوالدار نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔

''اس لئے کہ میرے اندازے کے مطابق یہ شخص کسی خاص مشن پر ہے اور اس نے اپنی کارروائی کے لئے بخت نگر کا انتخاب کر رکھا ہے۔ لہٰذا اس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے وہ اپنے کام سے کام رکھے گا اور اِدھر اُدھر کے مسائل میں خود کو اُلجھانے سے اجتناب برتے گا۔''

''لیکن جناب!'' وہ گمبھیر انداز میں بولا۔ ''بظاہر تو ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا۔ میں سمجھا نہیں، آپ حاجی صاحب کے کس مشن کی بات کر رہے ہیں؟''

''مشن کی نوعیت کے بارے میں تو سرِ دست میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''اگر ہم ایک حکمت عملی کے تحت آگے بڑھیں تو ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ہو سکتی ہے۔'' میں نے لمحاتی توقف کیا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔



''جمعہ خان! یقین کرو، مجھے اس حاجی برکت علی رحمت علی میں کچھ گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔ کیا گڑبڑ؟..... میں ابھی اس فیصلے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔ کیونکہ وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے، وہ روزمرہ اور روایت سے بہت ہٹ کر ہے۔''

جمعہ خان چند لمحات تک سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتا رہا، پھر اضطراری لہجے میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کے ساتھ کام کرتے ہوئے اب مجھے کافی عرصہ ہو گیا ہے۔ میں آپ کے انداز اور طریقے سے اچھی طرح واقف ہو گیا ہوں۔ آپ حاجی صاحب پر جتنی سنجیدگی سے شک کر رہے ہیں، اس کا ایک ہی مطلب ہے کہ حاجی صاحب کے معاملے میں کہیں نہ کہیں کوئی چکر ضرور ہے۔ آپ کی یہ بات بالکل درست ہے کہ حاجی صاحب کا رویّہ معمول سے بہت مختلف ہے، لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اس کی اصلیت تک رسائی کیسے حاصل کریں؟''

''اگر صحیح خطوط پر کوشش کی جائے تو مشکل سے مشکل کام کو بھی آسان بنایا جا سکتا ہے۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس مشن میں، میں تم سے کام لوں گا جمعہ خان! کیونکہ تم میرے لئے قابلِ بھروسہ ہو۔''

''یہ آپ کی محبت اور مہربانی ہے، ملک صاحب!'' وہ تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اس سلسلے میں کیا کردار ادا کر سکتا ہوں؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ''جمعہ خان! آج کل ہمارے تھانے کی حوالات تو خالی پڑی ہوئی ہے اور اِدھر نور کوٹ میں جرائم کا تناسب بھی کافی کم ہے، لہٰذا تھانے میں زیادہ مصروفیات نہیں ہیں۔ میں نے ابھی جس مشن کا ذکر کیا ہے اس کا راز صرف ہم دونوں کے بیچ رہے گا۔ تم سمجھ رہے ہو نا، میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں؟''

میں نے توقف کر کے سوالیہ نظروں سے حوالدار کو دیکھا تو اس نے گردن کو اثبات میں جنبش دی، پھر سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

''آپ بے فکر ہو جائیں ملک صاحب! میں اس راز کی اپنی جان سے بھی زیادہ حفاظت کروں گا۔ آپ حکم کریں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''تم کل مجھ سے چند دن کی چھٹی لے کر بیوی بچوں کے ہمراہ بخت نگر روانہ ہو

جاؤ۔'' میں نے اپنے منصوبے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''تھانے کے عملے کو یہی بتانا کہ تم کسی ضروری کام سے اپنی سسرال جا رہے ہو، وہاں کسی کو بیمار بھی کر سکتے ہو یا کوئی اور بھی بہانہ کیا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب! سمجھیں کہ میں آپ سے چھٹی لے کر چند روز کے لئے کسی ضروری کام سے بخت نگر چلا گیا۔ تھانے کے عملے میں کسی کو میری روانگی کی حقیقت کا علم نہیں۔'' وہ پُر جوش انداز میں بولا۔ ''آپ بتائیں، مجھے وہاں جا کر کیا کرنا ہوگا؟''

''ہوں.....'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''تمہیں بخت نگر میں رہتے ہوئے حاجی برکت علی رحمت علی کے معاملات کی ٹوہ لگانا ہے اور وہ اس طرح کہ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہو۔ وہ اور بخت نگر کے دیگر باسی یہی سمجھیں کہ تم حاجی اور اس کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ہو۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! میں آپ کی بات سمجھ گیا۔'' وہ پُر سوچ انداز میں بولا۔ ''اپنی سسرال اور بخت نگر کے لوگوں کو تو میں کسی قسم کا شک نہیں ہونے دوں گا۔ میں نہایت ہی ہوشیاری سے اس معاملے کو سنبھال لوں گا۔ لیکن مسئلہ زلیخا کا ہے۔''

حوالدار کو متذبذب دیکھا تو میں نے فوراً پوچھا۔

''زلیخا کا کیا مسئلہ ہے؟''

''بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں، معصوم اور سادہ ذہن۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''وہ مجھ سے کوئی سوال کئے بغیر ننھیال جانے کے لئے خوشی خوشی تیار ہو جائیں گے۔ لیکن میرا یہ اچانک پروگرام زلیخا کو ہضم نہیں ہوگا۔ وہ چند روز پہلے ہی بخت نگر سے لوٹی ہے۔ وہ سوال کر کر کے میرا دماغ ہلا دے گی۔ اسے اس روانگی کے حوالے سے مطمئن کرنا بہت ضروری ہے۔''

حوالدار ایک معقول بات کر رہا تھا۔ میں اس کی بیوی زلیخا کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا۔ ویسے تو دنیا بھر کی بیویاں اس معاملے میں کم و بیش ایک ہی جیسی ہوتی ہیں، لیکن زلیخا تجسس، کھوج، کرید اور ٹوہ کے حوالے سے دوسری بیویوں سے چار ہاتھ آگے نظر آتی تھی۔ حوالدار کی گمبھیرتا کے جواب میں، میں نے کہا۔

''جمعہ خان! تمہاری تشویش اپنی جگہ بجا ہے، میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس اچانک



پروگرام کے حوالے سے زلیخا تمہارا ناک میں دم کر دے گی۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ ہم مصلحت برائے تعمیر کی بنا پر اسے ایک خوب صورت چکر سے مطمئن کر دیں۔''

''خوب صورت چکر.....؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''کچھ بتائیں اس بارے میں ملک صاحب؟''

میں نے بتایا۔

''اگر تم اپنی بیوی کو اعتماد میں لے کر یہ بتاؤ کہ نہایت ہی خفیہ ذریعے سے پولیس کو ایک مخبر نے اطلاع دی ہے کہ آنے والے تین چار دنوں میں ایک خطرناک مفرور مجرم بخت نگر پہنچنے والا ہے، لہٰذا تم اس کی گرفتاری کے لئے پہلے ہی سے وہاں جا رہے ہو، تم سادہ لباس میں رہتے ہوئے اس اہم مشن کو سر کرو گے؟'' میں لمحے بھر کے لئے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''اس پلاننگ میں زور اور حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے تم زلیخا کو تاکید کر دینا کہ وہ اس منصوبے کے بارے میں کسی کو نہ بتائے۔ یہ نہایت ہی رازداری والا معاملہ ہے۔ تم زلیخا کو مزید پکا کرنے کے لئے اس مفرور مجرم کا کوئی فرضی نام بھی بتا سکتے ہو..... مثلاً قادرا، بلا، بخشو، گوگا، پوپی..... وغیرہ۔''

''یہ ترکیب اچھی ہے ملک صاحب!'' وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔ ''ویسے یہ بات ہے کہ میں جس معاملے کے بارے میں زلیخا کو تاکید کر دوں کہ اسے راز میں رکھنا ہے تو پھر سمجھیں اس کی زبان پر تالا لگ جاتا ہے۔''

وہ لمحے بھر کے لئے رکا، پھر جوشیلے لہجے میں بولا۔

''اگر آپ کا حکم ہو تو میں آج ہی بخت نگر روانہ ہو جاتا ہوں۔''

''آج نہیں، کل صبح۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''آج یہاں تھانے میں ایک دو ضروری کام ہیں اور رات کو تم زلیخا سے بات کر کے اسے صورتِ حال سے بھی آگاہ کر دینا تاکہ یہ کارروائی منطقی انداز میں آگے بڑھتی ہوئی نظر آئے۔''

''ٹھیک ہے ملک صاحب! جو آپ کا مشورہ۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

اگلی صبح میں نے ضروری ہدایات کے ساتھ، چند روز کے لئے حوالدار جمعہ خان کو مع اہل و عیال موضع بخت نگر روانہ کر دیا۔

تین روز کے بعد جمعہ خان میرے سامنے بیٹھا تھا اور اس وقت ہم دونوں تھانے کے اندر نہیں، بلکہ میرے کوارٹر میں تھے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میں عشاء کی نماز کے بعد سونے کے لئے لیٹ چکا تھا کہ کوارٹر کے بیرونی دروازے پر ہونے والی پراسرار دستک نے مجھے چارپائی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے سرکاری کوارٹر کے مختصر سے صحن سے گزر کر دروازہ کھولا تو سامنے جمعہ خان کو کھڑے دیکھ کر چونک اٹھا۔

''جمعہ خان! خیریت تو ہے؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

وہ میرے اضطراری سوال کا جواب دینے کے بجائے کوارٹر کے اندر آیا، پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آئیں، اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔''

میں اس کے ہمراہ کوارٹر کے اکلوتے کمرے میں آ گیا۔ ان دنوں موسم خاصا گرم ہو رہا تھا اور عموماً رات میں لوگ کھلے صحن وغیرہ میں سونے لگے تھے، لیکن میں نے ابھی تک اپنی چارپائی کو کمرے سے باہر نہیں نکالا تھا۔ رات کے آخری حصے میں فضا میں خنکی رچ بس جاتی تھی اور اوس بھی گرتی تھی، لہٰذا میں نے شب بسری کے لئے ابھی صحن کا رخ نہیں کیا تھا۔

حوالدار جمعہ خان اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ لگ بھگ نصف شب کو اس کی آمد سے یہ تو ظاہر تھا کہ وہ کوئی سنسنی خیز خبر ہی لے کر آیا ہوگا اور وہ خبر یقیناً حاجی برکت علی رحمت علی سے ہی متعلق ہوگی۔ لیکن وہ کیا خبر ہے؟..... یہ تو جمعہ خان ہی بتا سکتا تھا۔

جب ہم کمرے میں آرام سے بیٹھ گئے تو میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں جمعہ خان! اب بتاؤ، کیا بات ہے جو تمہیں یوں پُراسرار انداز میں، چوروں کی طرح چھپ کر میرے پاس آنا پڑا اور وہ بھی آدھی رات کو؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔



''ملک صاحب! میں ابھی سائیکل پر سوار ہو کر بخت نگر سے یہاں پہنچا ہوں۔ میری سائیکل آپ کے کوارٹر کے عقب میں کھڑی ہے۔ تھانے کے عملے میں سے کسی کو پتہ نہیں کہ میں اس وقت آپ کے ساتھ کوارٹر میں موجود ہوں۔ کسی نے مجھے اس طرف آتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں..... میں آپ سے بات کرنے کے بعد چپ چاپ، اسی طرح واپس بھی چلا جاؤں گا۔''

''یہ سب تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب تم مجھے وہ اہم بات بھی بتاؤ جس کے لئے تمہیں آدھی رات کو سائیکل پر سوار ہو کر تین میل کا کچا راستہ طے کرنا پڑا اور واپسی میں بھی تمہیں یہی تین میل کا فاصلہ طے کرنا ہے؟''

میرا کوارٹر تھانے کے عقبی حصے میں بنا ہوا تھا اور اس کوارٹر کے پچھواڑے کوئی باقاعدہ دیوار وغیرہ نہیں تھی۔ تھانے کی حدود کے ساتھ ہی، اس جانب کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، جو تا حدِ نگاہ پھیلا ہوا تھا۔ جمعہ خان اسی سمت سے میرے پاس پہنچا تھا۔

''جناب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' حوالدار نے معنی خیز انداز میں بتانا شروع کیا۔ ''یہ حاجت برکت علی رحمت علی کسی خطرناک مشن پر یہاں آیا ہے۔ میں نے پچھلے تین دن میں نہایت ہی احتیاط کے ساتھ جو معلومات اکٹھی کی ہیں، ان سے کسی گہری سازش کی بُو آتی ہے۔''

وہ لمحے بھر کے لئے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوا تو میں نے اسے ٹوکنا یا استفسار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''حاجی برکت علی رحمت علی.....''

''جمعہ خان!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے، اس حاجی کا نام کچھ زیادہ ہی طویل و عریض ہے۔ کیوں نہ ہم اسے مختصر کر دیں، مثلاً حاجی برکت علی یا حاجی رحمت علی یا پھر محض ''حاجی.....؟''

''آئیڈیا اچھا ہے جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں حاجی صاحب یا پھر صرف حاجی ٹھیک رہے گا۔''

''اور یہ حاجی اگر بعد میں، کسی حوالے سے مجرم ثابت ہو گیا تو ہم اس کے لئے

آسانی سے لفظ ''پاجی'' بھی استعمال کر سکتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے مجھے نہیں امید کہ اس بندے نے باقاعدہ حج بھی کیا ہو۔ بعض فراڈ لوگ اپنا دھندا چمکانے کے لئے مومنوں ایسی صورت بنا کر اور اپنے نام کے ساتھ بھاری بھرکم معزز الفاظ لگا کر بھی کام نکالتے رہتے ہیں۔ یہ حاجی بھی مجھے کوئی ایسا ہی کردار لگتا ہے۔''

''ملک صاحب! یہ بندہ بڑی ہوشیاری سے گاؤں کے سادہ مزاج لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ اس کا کاروبار میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' جمعہ خان تشویش ناک لہجے میں بولا۔

''میں وہی تو سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے بخت نگر میں حاجی کے جو ''کمالات'' دیکھے ہیں، وہ جلدی سے مجھے بتاؤ تاکہ میں اس سلسلے میں کسی نتیجے پر پہنچ سکوں۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔

''ملک صاحب! جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، حاجی صاحب کو بخت نگر میں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا اور اس مختصر سی مدت میں اس نے گاؤں والوں کو متاثر کر لیا ہے، خصوصاً مسجد کی تعمیر کے لئے ایک تگڑی رقم دے کر وہ نیک دل، خدا ترس اور عبادت گزار بھی ثابت ہو گیا ہے۔ میری معلومات کے مطابق وہ پانچوں وقت کی نماز ادا کرنے باقاعدہ مسجد میں جاتا ہے اور دیگر نمازیوں کے ساتھ بڑی محبت اور اخلاص سے پیش آتا ہے۔ اس کے برتاؤ نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا ہے، خاص طور پر امتیاز جٹ تو اس کی کچھ زیادہ ہی تعریف کرتا ہے۔''

''یہ امتیاز جٹ کون ہے؟'' جمعہ خان سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

اس نے جواب دیا۔

''امتیاز جٹ، حاجی کا مالک مکان ہے، ملک صاحب! امتیاز کے پاس دو مکان ہیں۔ ایک میں تو وہ خود اپنی بیوی بچوں کے ساتھ رہتا ہے جبکہ دوسرا اس نے حاجی کو کرائے پر دے دیا ہے۔ حاجی نے یہ مکان لیتے ہوئے کوئی مول تول نہیں کیا، امتیاز کے منہ مانگے کرائے پر وہ نہ صرف راضی ہو گیا بلکہ اس نے تین ماہ کا کرایہ پیشگی بھی ادا



کر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حاجی نے امتیاز کے بیٹے اشرف کو عراق بھی بھجوا دیا ہے۔''

''عراق بھجوا دیا ہے؟'' میں نے چونک کر جمعہ خان کی طرف دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

''ملک صاحب! حاجی، لوگوں کو بیرونِ ملک بھجوانے کا کام کرتا ہے۔'' جمعہ خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور یہ بات پورے بخت پور کو معلوم ہے۔ میرا سالا بھی سعودی عرب جانے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہاں مزدور کی بڑی اچھی اُجرت مل جاتی ہے۔ اور پھر حاجی اتنی آسانی سے باہر بھجواتا ہے کہ بخت نگر کے بھی نوجوان بیرونِ ملک جانے کے لئے پَر تول رہے ہیں۔ دو روز پہلے تین لڑکے بخت نگر سے گئے ہیں، جن میں امتیاز جٹ کا بیٹا اشرف بھی شامل تھا۔ مجھے پتہ چلا ہے، تین دن بعد ہفتے کی رات چار لڑکوں کا ایک اور گروپ بخت نگر سے روانہ ہونے والا ہے۔''

''ہوں.....'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ جو تم بتا رہے ہو کہ حاجی بڑی آسانی سے لوگوں کو بیرونِ ملک پہنچا دیتا ہے، اس کا کیا مطلب ہے، کیا اس کے اپنے جہاز چلتے ہیں؟''

''جہاز تو نہیں چلتے جناب! میں اس کے طریق کار کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ جتنی آسانی اور سہولت سے لوگوں کو لے کر جا رہا ہے، وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ خود بتائیں جناب! ایک پائی پیسہ لئے بغیر کوئی کسی کو ملک سے باہر لے کر جاتا ہے؟''

''کیا.....کیا وہ مفت میں لوگوں کو لے کر جا رہا ہے؟'' میں نے حیرت بھری نظر سے حوالدار کو دیکھا۔

''مفت میں نہیں جناب! اُدھار میں۔'' وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ''اور حاجی صاحب کی یہی ادا مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔ پتہ نہیں، وہ کس چکر میں ہے۔''

''اس کے چکر کا میں پتہ چلا لوں گا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تم مجھے اُس ''اُدھار'' کی تفصیل بتاؤ، جس کی بنا پر حاجی لوگوں کو ملک سے باہر لے کر جاتا ہے؟''

آج کل کی طرح اس زمانے میں، پاکستان سے باہر جا کر کام کرنے کا رجحان بہت کم تھا۔ تاہم اِکا دُکا افراد قسمت آزمائی کے لئے بیرونِ ملک جایا کرتے تھے کیونکہ وہاں محنت مزدوری کا معاوضہ بہت اچھا مل جاتا تھا۔ لیکن میرے تجربے اور مشاہدے میں یہ بات آئی تھی کہ پاکستان سے باہر جا کر ملازمت کرنے والوں میں زیادہ تعداد چھوٹے شہروں میں بسنے والے افراد کی ہوتی تھی اور کوئی ریکروٹنگ ایجنٹ یوں گاؤں دیہات میں ڈیرا جما کر نہیں بیٹھتا تھا بلکہ بیرونِ ملک جا کر کمائی کرنے کے خواہش مند افراد کو خود آگے بڑھ کر ایسے ایجنٹوں سے رابطہ کرنا پڑتا تھا، جن کا ٹھکانا عموماً شہروں میں ہوتا تھا، چاہے وہ شہر چھوٹے ہوں یا بڑے۔ اس تناظر میں حاجی برکت علی رحمت علی کا اسٹائل واقعی کسی خار کی طرح ذہن میں چبھتا تھا۔

حوالدار جمعہ خان نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''ملک صاحب! حاجی نے بخت نگر میں رہائش اختیار کرنے کے بعد لوگوں کو اپنے کاروبار کے بارے میں واضح طور پر بتا دیا تھا۔ اسے اپنے بزنس کی پبلسٹی کے لئے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اس کام کے لئے اس نے گاؤں کی مسجد کو چن لیا ہے۔ وہ پانچ وقت کی نماز پڑھنے وہاں جاتا ہے اور نماز ختم ہونے کے بعد بھی کافی دیر تک مسجد ہی میں بیٹھا رہتا ہے۔ اسی دوران وہ باتوں ہی باتوں میں اپنا کاروبار بھی چمکاتا رہتا ہے۔ خیر، میں آپ کو حاجی کے طریق کار کے بارے میں بتا رہا تھا۔'' تھوڑا توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید بتانے لگا۔

''بخت نگر کے لوگوں کو اس نے یہی بتا رکھا ہے کہ وہ بندوں کو سعودی عرب، کویت، عراق، ایران، لیبیا، لبنان، اُردن، بحرین اور دیگر عرب ممالک بھیجتا ہے۔ کسی بھی ملک میں جانے کا معاوضہ برابر ہے، پانچ ہزار روپے..... اور دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ کسی سے بھی پیشگی رقم نہیں لے رہا، بلکہ سب سے یہی کہہ رہا ہے کہ جب بندہ بیرونِ ملک جا کر ملازمت پر لگ جائے اور اسے پہلی تنخواہ مل جائے تو وہ اس کے وارثوں سے رقم وصول کر لے گا۔ حالانکہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایسے ایجنٹ رقم ایڈوانس میں لیتے ہیں اور اس قسم کے کام کے لئے پانچ ہزار کی رقم بھی بہت



زیادہ ہے۔ لیکن چونکہ لوگوں کو پیسے پہلے نہیں دینا پڑ رہے، اس لئے انہیں یہ رقم زیادہ نہیں لگ رہی۔ یہی سچ میرے ذہن کو اُلجھا رہا ہے۔''

''تمہارا ذہن بلاوجہ نہیں اُلجھ رہا، جمعہ خان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ حاجی اس ریکروٹنگ کے دھندے کی آڑ میں کوئی نہایت ہی خطرناک کھیل، کھیل رہا ہے۔ گاؤں کے سادہ مزاج لوگ اس شاطر کی چال کو نہیں سمجھ سکتے۔ میرا دھیان تو بار بار اسی گروہ کی طرف جا رہا ہے۔''

''کون سا گروہ جناب؟'' حوالدار نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس کے استفسار کو نظرانداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''جمعہ خان! تم نے بتایا ہے کہ حاجی کا تعلق لاہور سے ہے اور وہ بخت نگر میں امتیاز جٹ کا مکان کرائے پر لے کر رہ رہا ہے۔ اس کی فیملی میں کتنے افراد ہیں؟''

''فی الحال تو وہ اکیلا ہی آیا ہے۔'' جمعہ خان نے جواب دیا۔ ''گاؤں والوں کو اس نے بتایا ہے کہ اس کی ایک بیوی اور تین بچے ہیں، دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی صوفیہ نے تعلیم مکمل کر لی ہے، لیکن صدف اور عمران کے آج کل امتحانات ہو رہے ہیں، اس لئے ان لوگوں کو فوری طور پر گاؤں میں نہیں لایا جا سکتا۔ گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے پہلے وہ بخت نگر میں اپنے لئے ذاتی گھر تعمیر کرائے گا، پھر جولائی یا اگست میں وہ اپنی فیملی کو بھی لے آئے گا۔''

''بہت ہی کائیاں اور چالاک آدمی ہے یہ حاجی۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بچوں کے امتحانات تو مارچ کے ابتدائی حصے میں مکمل ہو گئے تھے۔ اکتیس مارچ کو نتیجہ نکلا ہے اور پورے پنجاب کے اسکولوں میں اب نئی جماعتیں شروع ہو چکی ہیں اور پھر.....'' میں نے ذرا توقف کر کے سانس ہموار کی، پھر کہا۔

''یہ بات کتنی عجیب سی ہے جمعہ خان! کہ ایک شخص جس کا کاروبار لاہور جیسے بڑے شہر میں عمدگی سے چل رہا ہو، اس کے بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے ہوں، وہ ضلع جھنگ کے اس دور دراز گاؤں میں آ کر کیوں رہائش اختیار کرے گا؟''

''وہ مستقل طور پر بخت نگر میں آ کر نہیں بسنا چاہتا۔''

''پھر.....؟'' میں نے چونک کر حوالدار کو دیکھا۔

اس نے جواب دیا۔

''حاجی نے گاؤں والوں کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ رہائش تو لاہور ہی میں رکھے گا، لیکن موسم سرما اور گرما کی چھٹیاں گزارنے کے لئے وہ بیوی بچوں کو یہاں لایا کرے گا۔''

''اور بخت نگر کے باسیوں نے اس کی بات کا یقین کر لیا ہے؟''

''جی ہاں۔'' حوالدار نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔ ''ان بے چاروں کے پاس یقین کرنے کے سوا اور کوئی راستہ ہی نہیں۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس پر بھروسہ کر رہے ہیں۔''

''اور ایک دن آنکھیں کھول کر انہیں اپنی حماقت پر رونا پڑے گا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا، پھر پوچھا۔ ''جمعہ خان! دو روز پہلے حاجی نے بخت نگر کے کن کن تین لڑکوں کو یہاں سے بھیجا ہے اور کیسے؟''

''ایک تو امتیاز جٹ کا بیٹا اشرف ہے۔ دوسرے دو لڑکوں کے نام رفیق اور جاوید ہیں۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''دو روز پہلے دوپہر کے وقت ایک جیپ بخت نگر پہنچی تھی، جس میں ایک ادھیڑ عمر شخص اور ایک خوب صورت نوجوان لڑکی موجود تھی۔ حاجی کے مطابق اس ادھیڑ عمر شخص کا نام سکندر شاہ ہے جو اس کا بزنس پارٹنر ہے اور وہ خوبرو لڑکی صوفیہ تھی، حاجی کی بڑی بیٹی۔''

حوالدار نے تھوڑا توقف کیا، ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''صوفیہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد حاجی کے کام میں ہاتھ بٹا رہی ہے اور لاہور والے آفس میں بیٹھتی ہے۔ اس کے ذمے انٹرویوز کا کام ہے۔ وہ بیرونِ ملک جانے کے خواہش مند افراد سے مختلف سوالات کر کے یہ جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کرتی ہے کہ وہ کس نوعیت کے کام کے لئے موزوں رہیں گے؟ یہاں بھی وہ اسی مقصد سے آئی تھی۔ اس نے اشرف، جاوید اور رفیق کا انٹرویو کیا اور شام سے تھوڑی دیر پہلے وہ ان تین نوجوانوں کو اپنے ساتھ لے کر واپس چلی گئی۔ ان تینوں کے گھر والے بہت خوش ہیں کہ ان کے بیٹے ملک سے باہر جا کر ڈھیروں دولت کمائیں گے



اور وہ خوشحال ہو جائیں گے۔ اگلے پھیرے میں عارف، مشتاق، حامد اور فرقان جائیں گے۔ تین دن بعد ہفتے کی رات صوفیہ اور سکندر شاہ دوبارہ بخت نگر آ کر انہیں جیپ میں لے جائیں گے۔''

وہ لمحے بھر کے لئے رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! بخت نگر کے نوجوانوں میں ایک خاص قسم کا جوش و خروش دیکھنے کو مل رہا ہے۔ جوانوں کے علاوہ ادھیڑ عمر افراد بھی بیرونِ ملک جانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں جیسا کہ میں نے اپنے سالے شمشاد احمد کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ سعودی عرب جانے کے لئے پَر تول رہا ہے۔''

''کیوں نہیں..... کیوں نہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''جب صوفیہ جیسی خوب صورت لڑکی انٹرویو کرے گی تو جوان کیا، بوڑھے بھی قسمت آزمائی کے لئے بے قرار دکھائی دیں گے۔ میں تو اس بات سے پریشان ہو رہا ہوں کہ اگر حاجی نے اپنا دھندا اسی طرح جاری رکھا تو بخت نگر کے علاوہ آس پاس کے علاقے بھی جوانوں سے خالی ہو جائیں گے۔ کیونکہ یہ خبر بخت نگر تک ہی محدود رہنے والی نہیں، وبائی امراض کی طرح بہت دور تک پھیلے گی۔ جب سارے کا سارا جوان خون بیرونِ ملک محنت مزدوری کے لئے چلا جائے گا تو یہاں کے کھیتوں اور کھلیانوں کا کیا ہوگا؟''

''یہ واقعی بہت فکرمندی کی بات ہے۔'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''پھر حاجی نے صوفیہ کی شادی کا تذکرہ کچھ ایسے انداز میں کیا ہے کہ بہت سے جوان تو بڑے رنگین اور سنگین خواب بھی دیکھنے لگے ہیں..... میرا مطلب ہے، صوفیہ کے حوالے سے۔''

''کیوں؟'' میں نے آنکھیں سکیڑ کر جمعہ خان کو دیکھا اور پوچھا۔ ''حاجی نے ایسی کون سی بات کر دی ہے؟''

''وہ گاہے بہ گاہے یہ کہتے سنا گیا ہے کہ صوفیہ کی وجہ سے اس کی راتوں کی نیند اُڑی ہوئی ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''اس کی پریشانی کے مطابق صوفیہ پوری طرح بالغ ہو چکی ہے، تعلیم یافتہ ہے، سلیقہ شعار اور خوش گفتار ہے لہٰذا وہ جلد از جلد اس کی شادی کر دینا چاہتا ہے، بس کوئی معقول سا لڑکا نظر آ جائے۔''

''اور بخت نگر کا ہر نوجوان خود کو ''معقول لڑکا'' ثابت کرنے کے لئے تیاری میں جُت گیا ہوگا۔'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''یہ کم بخت حاجی، لگتا ہے کہ انسانی نفسیات سے کھیلنا بہ خوبی جانتا ہے۔ اس کا جلد ہی کوئی ''بندوبست'' کرنا ہوگا۔''

میں نے لفظ ''بندوبست'' پر زور دیا تو حوالدار جمعہ خان نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! تھوڑی دیر پہلے میں نے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا، لیکن آپ نے جواب نہیں دیا۔''

میں فوراً سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ کون سے سوال کی طرف تھا۔ میں نے گردن کو اثباتی جنبش دی اور کہا۔

''تم اس گروہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہو نا جس کا میں نے ذکر کیا تھا؟''

''جی.....جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔

''جمعہ خان! کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، ان دنوں میں ضلع قصور کے ایک تھانے میں تعینات تھا۔ ایک روز مجھے ہیڈ کوارٹر جانے کا اتفاق ہوا تو یہ قصہ میرے علم میں آیا تھا۔ اس حوالے سے میں بڑا خوش قسمت واقع ہوا ہوں کہ مجھے اپنے سینئر افسران کے ساتھ بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا بارہا موقع ملتا رہا ہے۔ ایسی ہی ایک نشست میں اس گروہ کا تذکرہ بھی ہوا، جس کا ذکر میں نے تمہارے سامنے کیا ہے۔ حاجی کی مشکوک سرگرمیاں دیکھ کر میرا دھیان بار بار اسی گروہ کی طرف جا رہا ہے۔''

میں نے تھوڑا توقف کرنے کے بعد ایک گہری سانس خارج کی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''وہ گروہ بڑے منظم طریقے سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ کُل چار افراد تھے جن کا سرغنہ صفدر سلطان نامی ایک شخص تھا۔ یہ چاروں چھوٹے شہروں اور قصبہ جات وغیرہ میں جا کر ایسے نوجوانوں کو تلاش کرتے، جن کی عمریں پندرہ اور پچیس سال کے درمیان ہوں، وہ صحت مند اور جفاکش ہوں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ یا تو وہ بیروزگار ہوں اور یا پھر کوئی ایسا کام دھندا کرتے ہوں، جس سے معقول آمدنی نہ ہوتی ہو۔ وہ ایسے افراد کو بڑے شہروں میں اچھی اور زیادہ آمدنی والی نوکریوں کے خواب



دکھاتے اور اپنے ساتھ لے آتے تھے۔ انہوں نے اپنا ہیڈ کوارٹر لاہور میں بنا رکھا تھا۔ بنیادی طور پر وہ ایک خطرناک کام کر رہے تھے۔ لوگوں کو ملازمتیں وغیرہ دلوانا تو ایک ڈھونگ تھا۔ لوگ ان کی سنہری اور چکنی چپڑی باتوں میں ایسے پھنستے کہ پھر فرار کی کوئی راہ کھلی نہ رہتی۔''

میں نے لمحاتی توقف کے بعد سنسنی خیز انداز میں اضافہ کیا۔

''صفدر سلطان اور اس کے تین ساتھی درحقیقت بردہ فروش تھے۔''

''بردہ فروش.....؟'' جمعہ خان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''یعنی وہ دھوکے سے اپنے جال میں پھانسے ہوئے لوگوں کو فروخت کر دیتے تھے؟''

''بالکل..... بردہ فروش یہی کرتے ہیں۔'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔ ''لاہور پہنچانے کے بعد وہ انہیں دو دو، تین تین کر کے کراچی بھجوا دیتے۔ اس کام کے لئے ایک الگ ٹیم موجود تھی۔ مبینہ بردوں سے کہا جاتا کہ انہیں پانی کے جہاز پر نوکری ملی ہے۔ اس طرح وہ ستم نصیب انسانوں کے ایک ایسے اسمگلر کے ہتھے چڑھ جاتے، جو انہیں اپنے ساتھ سمندری راستے سے موریطانیہ، تنزانیہ اور موزمبیق وغیرہ لے جاتا، جہاں ایک منڈی میں باقاعدہ ان کا نیلام ہوتا، تب ان لوگوں کو معلوم ہوتا کہ وہ زندگی بھر کے لئے غلام بنائے جا چکے ہیں۔ بہرحال.....'' میں سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''پولیس نے نہایت ہی خفیہ انداز میں اس گروہ کی نگرانی کی اور ایک رات انہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔ پولیس کے ہتھے صرف صفدر سلطان اور اس کے تین ساتھی ہی چڑھے تھے، آگے کی چین کو گرفت میں نہیں لایا جا سکا تھا۔ صفدر سلطان اینڈ کمپنی کی گرفتاری سے اگلا سیٹ اپ محتاط ہو گیا اور اس سے پہلے کہ پولیس ان پر ہاتھ ڈالتی، وہ گدھے کے سینگوں کے مانند منظر سے غائب ہو گئے۔ پولیس کو اس اسٹیشن میں جزوی کامیابی ہو سکی تھی۔ صفدر سلطان اور اس کے تینوں ساتھیوں پر باقاعدہ مقدمات چلائے گئے اور وہ لوگ عدالت سے سزا پا کر جیل چلے گئے تھے اور اب بھی یقیناً وہ کسی جیل ہی میں سڑ رہے ہوں گے۔ کچھ عرصہ پہلے تک میرا یہی خیال تھا، لیکن حاجی برکت علی رحمت علی کی خفیہ سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے میں یہ سوچنے پر مجبور ہو رہا

ہوں کہ کہیں یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی تو نہیں۔"

"آپ کی بات دل کو لگ رہی ہے، ملک صاحب!" حوالدار تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "حاجی نے جن تین نوجوانوں کو ملک سے باہر بھجوانے کے لئے بخت نگر سے روانہ کیا ہے، ان کی عمریں جاوید اٹھارہ سال، رفیق تئیس سال اور اشرف چوبیس سال ہیں۔ اسی طرح عارف، حامد، فرقان اور مشتاق کی عمریں بھی بالترتیب سولہ، اُنیس، بیس اور بائیس سال ہیں۔ یہ زیادہ سے زیادہ محنت کرنے کی عمر ہے اور اس قسم کے بردے زیادہ قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔"

میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جمعہ خان! تمہاری معلومات کے مطابق سکندر شاہ اور صوفیہ آنے والے ہفتہ کو دوبارہ بخت نگر پہنچیں گے اور اسی رات ان چار جوانوں کو اپنے ہمراہ لاہور لے جائیں گے۔"

"جی ملک صاحب! میری معلومات غلط نہیں ہو سکتیں۔" وہ پُر وثوق انداز میں بولا۔ "میں نے غیر محسوس انداز میں آپ کی ہدایت کے مطابق بڑی محنت اور احتیاط سے یہ معلومات اکٹھا کی ہیں۔ ہمیں ہفتے کی شام بخت نگر میں ایک زبردست کارروائی ڈالنا چاہئے۔ میں نے سلطان شاہ کی جیپ کا نمبر بھی نوٹ کر لیا ہے۔"

"ویری گڈ، شاباش۔" میں نے تعریفی نظروں سے جمعہ خان کو دیکھا اور جیپ کے نمبر کے حوالے سے استفسار کیا۔

اس نے بتایا۔

"ملک صاحب! وہ ایک لینڈ روور جیپ ہے، جس پر لاہور کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے.....ایل ای ڈی۔ اٹھہتر۔"

"ہوں۔" میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جمعہ خان! کارروائی تو ڈالی جائے گی اور بڑی بھرپور ڈالی جائے گی۔ لیکن اس کے لئے تیاری کرنا ہوگی۔ آنے والے ہفتے کے دن میں ابھی کافی وقت ہے۔ مجھے امید ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم ایک کام کرو....."

میں بولتے بولتے رُکا تو حوالدار نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔



"جی ملک صاحب! کون سا کام؟"

میں نے اس کے استفسار کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

"تمہارا ابھی کا کیا پروگرام ہے؟.....میرا مطلب ہے، تم ابھی واپس بخت نگر جاؤ گے یا رات ادھر ہی نور کوٹ میں گزارنے کا پروگرام ہے؟"

"میں زلیخا سے یہ کہہ کر آیا تھا کہ ایک ضروری کام کے لئے مجھے نور کوٹ جانا ہے۔" حوالدار نے جواب دیا۔ "اگر جلدی فارغ ہو گیا تو واپس آ جاؤں گا، ورنہ ادھر ہی رک جاؤں گا اور اگلی صبح آؤں گا۔ جب سے میں نے اسے بتایا ہے کہ میں ایک خطرناک مجرم کی تلاش اور گرفتاری کے سلسلے میں ایک خاص مشن پر ہوں، وہ زیادہ سوال نہیں کرتی۔ اگر میں رات کو واپس بخت نگر نہیں بھی گیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

میں نے ایک جماہی لی اور رِسٹ واچ پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ اتنی رات گئے واپس جانا مناسب نہیں، خوامخواہ تمہاری سسرال والوں کو بھی شک ہوگا کہ یہ تم کس قسم کی مصروفیات میں پھنسے ہوئے ہو۔"

"ٹھیک ہے ملک صاحب! میں صبح سویرے نکل جاؤں گا۔" وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "آپ مجھے کوئی کام بتا رہے تھے؟"

"ہاں، میں کہہ رہا تھا....." میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے بخت نگر میں رہتے ہوئے بڑے بڑے کام کی معلومات اکٹھا کی ہیں۔ میرے خیال میں، آنے والے دو تین دن بھی تمہیں وہیں گزارنا چاہئیں، تاکہ حاجی اور اس کے عزائم مزید کھل کر سامنے آ سکیں۔ ہم جمعہ کی شام کو دوبارہ ملیں گے اور تازہ ترین صورتِ حال کی روشنی میں ہفتے کی شام کے لئے کوئی مؤثر حکمت عملی ترتیب دیں گے۔ اگر حاجی پر کچا ہاتھ ڈالا گیا تو کام خراب ہو جائے گا۔ ہماری تیاری اور کارروائی میں کوئی کمی، کوئی جھول نہیں ہونا چاہئے۔"

"بالکل ٹھیک۔" وہ فرمانبرداری سے بولا۔ "میں علی الصبح بخت نگر روانہ ہو جاتا ہوں اور وہاں کا محاذ سنبھال لیتا ہوں۔ اس دوران میں، یعنی جمعے کی شام سے پہلے اگر

کوئی ایمرجنسی پیش آ گئی تو میں آپ کے پاس آ جاؤں گا۔"

میں نے اس کی تجویز کی تائید کی اور پوچھا۔

"جمعہ خان! کیا تمہیں اس بات کا اندازہ ہے کہ جیپ کس راستے سے بخت نگر پہنچی تھی اور واپسی میں اس نے کون سا راستہ اختیار کیا تھا؟"

"جناب! میں نے بھی اس بارے میں چھان بین کی ہے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ "وہ لوگ جھنگ کی طرف سے آئے تھے، یعنی ہمارے تھانے کے سامنے سے گزرے تھے۔ اسی سڑک پر آگے جا کر جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ایک کچا راستہ شمال کی سمت نکلتا ہے جو اسی درجے کے زاویے پر آگے بڑھتے ہوئے سیدھا بخت نگر تک پہنچتا ہے۔ سکندر شاہ نے آمد اور شد کے لئے یہی راستہ اختیار کیا تھا۔"

"ہوں....." میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "اگر سکندر شاہ، بخت نگر کے جوانوں کو لے کر واقعی لاہور گیا ہے تو اسے میرے تھانے کے سامنے سے گزر کر پہلے جھنگ شہر جانا پڑا ہوگا اور وہ جھنگ شہر سے آگے لاہور کی سمت روانہ ہوا ہوگا۔"

میرے کوارٹر میں صرف ایک ہی چارپائی تھی جو کہ میرے استعمال میں رہتی تھی۔ یہ رات حوالدار جمعہ خان کو بھی اسی کوارٹر میں گزارنا تھی، لہٰذا میں متلاشی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے شب بسری کی سیٹنگ کے بارے میں سوچنے لگا۔

جمعہ خان نے فوراً بھانپ لیا کہ میں کون سے مسئلے کو حل کرنے کے لئے ذہنی توانائی صرف کر رہا ہوں، مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے اس نے کہا۔

"ملک صاحب! آپ اطمینان سے چارپائی پر سو جائیں، میں زمین پر بستر لگا لوں گا۔"

"زمین پر؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے، محمدی بستر۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ آپ کی چٹائی رکھی ہے نا۔" اس نے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں وہ بچھا کر اطمینان سے سو جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں، چند گھنٹوں ہی کی تو بات ہے۔"

میں نے نماز کی ادائیگی کے لئے ایک چٹائی مختص کر رکھی تھی، یہ خاصے بڑے سائز



کی چٹائی تھی۔ میں کوارٹر کے فرش پر مذکورہ چٹائی کو بچھاتا، پھر اس کے اوپر جائے نماز ڈال کر اللہ کے حضور حاضر ہو جاتا۔ حوالدار کی تجویز کے جواب میں، میں نے کہا۔

"بات چند گھنٹوں کی ہو یا رات بھر کی، لیکن مساوات اور رواداری اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں خود تو چارپائی پر آرام سے سوؤں اور تم چٹائی پر رات گزارو۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے ملک صاحب.....؟" وہ اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"بہت فرق پڑتا ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سارا ثواب تم سمیٹ لو اور میں مزے سے بے خبر سوتا رہوں۔"

وہ میری سنجیدگی کے لبادے میں چھپے ہوئے نکتے تک نہ پہنچ سکا اور متذبذب لہجے میں مستفسر ہوا۔

"یہ آپ کس قسم کے ثواب کی بات کر رہے ہیں جناب؟"

"محمدی بستر پر شب بسری کا ثواب۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"اوہ....." وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔

"جمعہ خان! یہ چٹائی اتنی بڑی ہے کہ ہم دونوں بہ سہولت اس پر سو سکتے ہیں اور برابر کا ثواب کما سکتے ہیں۔"

"لیکن جناب! آپ تو تھانہ انچارج....."

"میں تھانہ انچارج اور تم حوالدار صرف فرائض کی بجا آوری کے لئے ہیں اور.....وہ بھی ڈیوٹی کے اوقات میں۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اس وقت نہ تم حوالدار ہو اور نہ ہی میں تھانے دار۔ ہم صرف دو انسان ہیں اور انسانیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم دونوں میں برابری اور توازن قائم رہے۔"

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

❀.....❀

آئندہ روز میں ایس پی آفس جا کر علی نواز گوندل سے ملا۔

ایس پی گوندل صاحب بڑے ہی تجربہ کار پولیس آفیسر تھے۔ ابھی چند سال پہلے ان کا انتقال ہوا ہے۔ حق مغفرت کرے۔ بڑے ہی بذلہ سنج اور سرد و گرم چشیدہ تھے۔ نوے کے قریب عمر پائی تھی انہوں نے۔ گوندل صاحب ہمیشہ محبت اور مہربانی سے پیش آتے تھے۔ میں نے ان کی صحبت میں یا یوں سمجھیں کہ ان کی ماتحتی میں کام کرتے ہوئے بہت کچھ سیکھا تھا۔ انسان فانی ہے، جو شخص دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن واپس بھی جانا ہے۔ پتہ نہیں، کب اپنا بھی بلاوا آ جائے.....!

جب میں گوندل صاحب کے کمرے میں پہنچا تو وہ فرصت میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں حاجی برکت علی رحمت علی کے بارے میں پوری تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ ہمارے درمیان بردہ فروشی کے امکانات پر بھی تبادلۂ خیال ہوا۔ انہوں نے توجہ سے میری بات سنی اور گمبھیر لہجے میں کہا۔

''صفدر حیات! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔ مجھے بھی یہ حاجی خاصا گڑبڑ لگ رہا ہے۔ بہرحال، بخت نگر تمہارے تھانے کی حدود میں آتا ہے، تم حاجی کی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھو۔ اس سلسلے میں میری طرف سے کسی مدد یا تعاون کی ضرورت ہو تو بتاؤ؟''

''بالکل ضرورت ہے سر!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے حاجی کو بے نقاب کرنے کے لئے جو منصوبہ بنایا ہے، وہ آپ کے تعاون کے بغیر کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔''

''ہاں بتاؤ، تمہیں کس قسم کا تعاون چاہئے؟'' وہ ٹھوس لہجے میں مستفسر ہوئے۔

میں نے کہا۔

''مجھے ایک گاڑی کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی ایسی گاڑی جس میں بیٹھ کر میں اپنے تھانے سے لاہور تک کا سفر طے کر سکوں۔''

''ہوں.....'' انہوں نے گہری نظر سے مجھے گھورا اور کہا۔ ''گاڑی مہیا کر دی جائے گی، تمہارا منصوبہ کیا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔

''سر! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، آنے والے ہفتے کی شام حاجی، بخت نگر



کے مزید چار جوانوں کو جیپ کے ذریعے لاہور بھجوانے والا ہے۔ اس سے پہلے جو تین نوجوان گئے ہیں، ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا۔ حاجی کا جتنا سیٹ اپ بخت نگر میں کام کر رہا ہے اس میں ایسا کچھ نظر نہیں آتا جس سے نتائج تک رسائی حاصل کی جا سکے۔ ویسے میں نے حوالدار جمعہ خان کو سادہ لباس میں، بخت نگر میں تعینات کر رکھا ہے۔ بخت نگر میں چونکہ اس کی سسرال ہے لہٰذا اسے کام کرنے میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑ رہا۔ جمعہ خان مجھے وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کرتا رہتا ہے، مگر میں یہ چاہتا ہوں.....'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میری خواہش ہے کہ ہفتے کی شام جب جیپ بخت نگر کے چار نوجوانوں کو لے کر لاہور کی سمت سفر کا آغاز کرے تو میں اس کا تعاقب کروں تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ حاجی ان سادہ لوح دیہاتیوں کو بیرونِ ملک بھجوانے کا جھانسہ دے کر کہاں پہنچا رہا ہے۔ اس سلسلے میں، میں جو بھی تحقیق کروں گا، اس کی رپورٹ پہلی فرصت میں، میں آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔''

''آئیڈیا تو بہت اچھا ہے صفدر حیات!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔ ''لیکن اس کام میں ایک محکمہ جاتی قباحت ہے۔''

''وہ کیا سر؟'' میں نے اپنی رائے کا اظہار کئے بغیر انہی سے پوچھ لیا۔

حالانکہ میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا، ان کا اشارہ کس طرف ہے۔ ہر تھانے کی اپنی ایک مخصوص حدود ہوتی ہے اور تھانے دار کو اسی حدود کے اندر رہتے ہوئے اپنے فرائض کو انجام دینا پڑتا ہے۔ میرا لاہور جانا اس حوالے سے اختیار سے باہر یا حدود سے متجاوز نظر آتا تھا۔ تاہم کسی کیس کے سلسلے میں، ایک علاقے کے ذمے دار کسی دوسرے علاقے کے ذمے داروں سے تعاون اور مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ میں جس علاقے کا تھانے دار تھا، بخت نگر اس میں شامل تھا۔ چنانچہ حاجی کے حوالے سے میں بخت نگر کی حدود میں ہر قسم کی کارروائی کا مجاز تھا۔ یہ مناسب اور ممکن نہیں تھا کہ میں لاہور جا کر کسی قسم کی سرگرمی دکھاؤں۔ ایس پی علی نواز گوندل نے میرے استفسار کے جواب میں وہی سب کچھ کہا، جس کی میں توقع کر رہا تھا۔ بات کے اختتام پر انہوں نے کہا۔

"صفدر حیات! تم خود خاصے سمجھ دار ہو۔"

"سر! میں آپ کی بات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں نے ایسا پروگرام ترتیب دیا ہے، جس میں کسی قسم کی مداخلت کا اندیشہ نہیں۔ میں یہاں سے سیدھا لاہور جاؤں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ حاجی کا وہاں کیا دھندا ہے۔ وہ گاؤں دیہات سے گھیر کر لے جائے جانے والے نوجوانوں کو واقعی بیرونِ ملک بھیجتا ہے یا پھر ان کے ساتھ کوئی اور "سلوک" کرتا ہے۔ بردہ فروشی کے موضوع پر ہم خاصی تفصیلی بات کر چکے ہیں۔ اس امکان کو کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے تھوڑا توقف کیا، ایک گہری سانس لی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میں حاجی کے خلاف کچھ ایسے ثبوت اور شواہد اکٹھا کرنا چاہتا ہوں جن کی بنا پر میں بخت نگر میں اس پر پکا ہاتھ ڈال سکوں۔ میں اس کے خلاف جو بھی کارروائی کروں گا، وہ اپنے تھانے کی حدود، اپنے اختیارات میں رہتے ہوئے قانون کے مطابق کروں گا۔ اپنے علاقے سے باہر میں کسی نوعیت کی کوئی سرگرمی نہیں دکھاؤں گا۔ لاہور والے مشن میں میری حیثیت خاموش تماشائی ایسی ہو گی اور یہ تماشائی وہاں جو بھی تماشا دیکھے گا، اس کی رپورٹ پہلے آپ کو پیش کرے گا، پھر آپ کی صلاح حاصل کرنے کے بعد آگے پیش قدمی کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" گوندل صاحب نے ایک پُرسکون سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "یہ طریقہ بھی معقول ہے اور قانون کے دائرے کے اندر بھی۔ تم کب لاہور کے لئے روانہ ہونا چاہتے ہو؟"

"سر! تک کی معلومات کے مطابق حاجی کا پارٹنر سکندر شاہ اور صوفیہ ہفتے کو بخت نگر پہنچیں گے اور اسی شام چار لڑکوں کو اپنے ساتھ جیپ میں بٹھا کر لاہور لے جائیں گے۔ اگر ان کے اس پروگرام میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تو مجھے ہفتے کی دوپہر کو گاڑی چاہئے ہو گی۔"

"ہوں۔" گوندل صاحب نے پُرسوچ انداز میں ہنکارا بھرا اور گہری سنجیدگی سے



بولے۔ "ہفتے کی صبح میری گاڑی ڈرائیور سمیت تمہارے پاس پہنچ جائے گی۔ میرا ڈرائیور گل داد بھی ایک تجربہ کار پولیس والا ہے، میں اسے کام کی نوعیت کے حوالے سے بریف کر دوں گا۔ وہ خوامخواہ کے سوالات پوچھ کر تمہارا دماغ خراب نہیں کرے گا۔ تم اطمینان سے اپنی تفتیش مکمل کر لو۔ لاہور سے واپسی پر سیدھا میرے پاس آنا اور اپنی تحقیق کی رپورٹ پیش کرنا۔"

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئے پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"قبل از وقت اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ تمہیں لاہور میں کتنا وقت لگے گا۔ وہاں دیر بھی ہو سکتی ہے۔ لہٰذا مناسب یہی ہو گا کہ تم لوگ اگلے روز یعنی اتوار کو واپس آ جاؤ۔ گل داد کے رشتے دار لاہور میں موجود ہیں، تم رات ان کے گھر میں ٹھہر سکتے ہو۔ میں اس سلسلے میں گل داد کو ضروری ہدایات دے دوں گا۔"

"یہ پروگرام بالکل مناسب ہے سر!" میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔

انہوں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

"لاہور کی جانب روانہ ہونے سے پہلے تم حوالدار جمعہ خان کو واپس تھانے بلا لینا۔ تمہاری غیر موجودگی میں کسی ذمے دار تجربہ کار شخص کا تھانے میں حاضر رہنا بہت ضروری ہے۔"

"او کے سر!..... میں ایسا ہی کروں گا۔" میں نے فرمانبرداری سے کہا۔

"ایک بات اور....." وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ "ظاہر ہے، تم اور گل داد عوامی لباس میں لاہور جاؤ گے، تاکہ کسی کو..... خصوصاً حاجی اینڈ کمپنی کو کسی قسم کا کوئی شک نہ ہو۔ میں کار کی پلیٹ پر سے "پنجاب پولیس" کے الفاظ بھی عارضی طور پر غائب کر دوں گا۔ اس کے علاوہ تمہیں تعاقب میں بھی بہت احتیاط سے کام لینا ہو گا، جیپ والوں کو یہ احساس نہیں ہونا چاہئے کہ تھانے سے کوئی کار ان کے پیچھے لگی ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر!" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔ "تعاقب کا آغاز یا تو چند سو گز پیچھے سے کیا جائے گا اور یا پھر چند سو گز آگے سے۔ یعنی میں جھنگ شہر کی طرف جانے والی سڑک پر پہلے سے موجود رہوں گا۔ لینڈ روور جیپ جیسے ہی بخت نگر سے آنے والی کچی سڑک کو چھوڑ کر نیم پختہ سڑک پر چڑھے گی، غیر محسوس انداز میں اس

کا تعاقب شروع ہو جائے گا۔ آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں کسی بھی مرحلے پر احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑوں گا۔''

''ویری گڈ!'' انہوں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''وِش یو گڈ لک!''

میں نے اس گراں قدر تعاون پر ان کا شکریہ ادا کیا اور واپس آ گیا۔

جمعے کی شام کو حسبِ وعدہ حوالدار جمعہ خان میرے پاس موجود تھا۔ ہماری یہ ملاقات تھانے کے اندر ہی ہوئی۔ اس وقت تھانے میں عملے کے دیگر افراد بھی موجود تھے۔ جس کسی نے بھی اس کی واپسی کے بارے میں سوال کیا، اس نے انہیں یہ کہہ کر خوب صورتی سے ٹال دیا کہ وہ ایک دو دن میں واپس آ جائے گا۔ ابھی تو وہ صرف تھانہ انچارج صاحب سے ملنے آیا ہے۔ یہی بات جب جمعہ خان نے مجھے بتائی تو میں نے کہا۔

''جمعہ خان! تم نے اپنے ساتھیوں سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ تم واقعی کل شام کو واپس آ جاؤ گے۔''

''جی.....؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ادھر بخت نگر سے سکندر شاہ کی جیپ جوانوں کو لے کر روانہ ہوئی، ادھر تم بھی واپسی کا سفر شروع کر دو گے۔ جب تم تھانے پہنچو گے تو میں تمہیں یہاں نظر آؤں گا۔ میری غیر موجودگی میں ایک دو دن تمہیں یہاں کا نظام سنبھالنا ہے۔ کیونکہ میرے بعد یہاں کے عملے میں تم ہی سب سے زیادہ سینئر ہو۔''

اس نے حیرت اور اُلجھن کی ملی جلی کیفیت میں میری پوری بات سنی اور پوچھنے لگا۔

''جناب ملک صاحب! آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

اس استفسار کے جواب میں، میں نے مختصر الفاظ میں اسے اپنی اور گوندل صاحب کی ملاقات اور آئندہ کی پلاننگ کے بارے میں آگاہ کر دیا اور آخر میں کہا۔

''یہ منصوبہ صرف تین افراد کے درمیان ہے..... یعنی ایس پی صاحب، میں اور تم۔ اس راز کی حفاظت کی ذمے داری تم پر بھی عائد ہوتی ہے۔''



''آپ فکر نہ کریں، ملک صاحب!'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں کسی بھی مرحلے پر غیر ذمے داری کا مظاہرہ نہیں کروں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''ادھر بخت نگر کی کیا صورتِ حال ہے؟''

''سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہاں کے چار جوان بڑی بے تابی سے ہفتے کی شام کا انتظار کر رہے ہیں، جب وہ سکندر شاہ کے ساتھ جیپ پر سوار ہو کر بخت نگر سے لاہور کی سمت روانہ ہوں گے۔''

''ہفتے کی شام کا تو مجھے بھی بے چینی سے انتظار ہے، جمعہ خان!'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''یہ بتاؤ، حاجی نے پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں کی؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''پروگرام وہی ہے، جو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ میں نے اپنی معلومات کو تازہ رکھنے کے لئے ان چار نوجوانوں سے بھی گاہے بہ گاہے اور فرداً فرداً بات کی ہے۔ انہوں نے روانگی کی تیاری مکمل کر لی ہے، رختِ سفر باندھا جا چکا ہے، بس اس بات کا انتظار ہے کہ صوفیہ ان کا انٹرویو لینے بخت نگر پہنچے اور وہ پاس ہو کر دکھا دیں۔ صوفیہ کے ذکر پر ان کے چہرے گلنار ہو جاتے ہیں اور وہ کچھ اس قسم کا ردِعمل ظاہر کرنے لگتے ہیں، جیسے صوفیہ انٹرویو کے بہانے ان میں سے کسی کو اپنے لئے منتخب کرنے آ رہی ہو۔''

''اس کم بخت حاجی نے چکر ہی ایسا چلایا ہے کہ نوجوانوں کیا، ادھیڑ عمر اور بوڑھے مردوں کے دلوں میں بھی کھدبد ہو رہی ہو گی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے، یہ صوفیہ اس کی بیٹی نہیں ہو گی، بلکہ وہ اس کے سسٹم کا ایک پُرزہ ہے۔ کوئی باپ اپنی خوب صورت، خوب رو بیٹی کو اس قسم کے گڑبڑ کاروبار میں نہیں لگاتا۔''

''مجھے بھی یہی لگتا ہے ملک صاحب!'' حوالدار تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عارف، حامد، مشتاق اور فرقان کی زبانی صوفیہ کے حُسن اور اداؤں کے جو قصے مجھ تک پہنچے ہیں، وہ خاصے رنگین اور سنگین ہیں۔''

میں نے گمبھیر لہجے میں استفسار کیا۔

''جمعہ خان! ان نوجوانوں سے بات چیت کرتے ہوئے تم نے احتیاط برتی ہے

نا؟... میرا مطلب ہے، انہیں کسی مرحلے پر شک تو نہیں ہوا کہ تم انہیں کرید رہے ہو؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''میرا انداز بالکل نارمل رہا ہے۔''

''گاؤں کے دیگر لوگوں نے تمہاری وہاں موجودگی کو کسی خاص انداز میں محسوس نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بالکل نہیں، ملک صاحب!'' اس نے پُر یقین انداز میں کہا۔

میں نے پوچھا۔

''اس دوران میں حاجی برکت علی رحمت علی سے تمہاری ملاقات ہوئی؟''

حوالدار نے بتایا۔

''میں باقاعدہ اس سے ملنے تو نہیں گیا، جناب! لیکن یہ بات مجھے معلوم تھی کہ وہ پنجگانہ نماز کے لئے مسجد میں جاتا ہے۔ اس کی اسی ''ادا'' نے گاؤں والوں کو متاثر کر رکھا ہے۔ وہ اسے ایک پرہیزگار اور عبادت گزار شخص تسلیم کر چکے ہیں، اسی لئے وہ آنکھیں بند کر کے اس پر اور اس کے دھندے پر بھروسا کر رہے ہیں۔''

وہ لمحے بھر کو سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''میں بھی دن میں ایک آدھ بار نماز ادا کرنے کے لئے مسجد چلا جاتا ہوں۔ وہیں پر میری اس سے دعا سلام ہوئی ہے۔ میں نے اس سے زیادہ گھلنے ملنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہی زیادہ بات چیت کی ہے، تاکہ وہ میری جانب سے کسی کھٹکے میں مبتلا نہ ہو جائے۔ میرا انداز اور رویہ بالکل نارمل اور سرسری رہا ہے، البتہ میں نے اس سے ڈبل نام کا معمہ پوچھ لیا ہے۔''

''کیا توجیہ کی ہے اس نے اس دہرے نام کی؟'' وہ متوقف ہوا تو میں نے پوچھ لیا۔

''حاجی نے بتایا ہے کہ اس کا اصل نام تو برکت علی ہے۔'' حوالدار وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''رحمت علی اس کے چھوٹے بھائی کا نام تھا، جو عین عالمِ شباب میں اس دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔ حاجی اپنے چھوٹے بھائی رحمت علی سے بے پناہ محبت



کرتا تھا۔ اس کی موت نے حاجی کو کافی عرصے تک بے کل اور افسردہ رکھا اور اس بھائی کی یاد کو سدا تازہ رکھنے کے لئے حاجی نے اس کا نام اپنے نام کے آگے لگا لیا۔''

''بہت خوب۔'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''لوگ اپنے نام کے ساتھ عموماً باپ کا نام جوڑتے ہیں اور حاجی نے چھوٹے بھائی کے نام کو اپنے نام کے ساتھ نتھی کر لیا ہے۔ یہ تو وہی بات ہوئی..... تمہارا ''سو'' چھ بیسیوں کا اور ہمارا ''سو'' چار بیسیوں کا، کر لو جو کرنا ہے۔ بہرحال..... مجھے حاجی کے حلیے اور وضع قطع کے بارے میں کچھ بتاؤ؟''

حوالدار جمعہ خان نے بڑی تفصیل سے میرے استفسار کا جواب دیا اور آخر میں بولا۔

''ملک صاحب! حاجی کی شخصیت کا تاثر کچھ اچھا نہیں ہے۔ وہ تو گاؤں والوں کی سادگی اور معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔ ورنہ اگر اس کی عبادت اور لچھے دار باتوں سے اوپر آ کر دیکھا جائے تو وہ خاصا مکروہ نظر آئے گا۔''

''ہوں.....'' میں نے اپنی پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر کہا۔ ''جمعہ خان! تم نے مجھے سکندر شاہ کی جیپ کا میک اور نمبر بتا دیا ہے۔ وہ ایک رف اینڈ ٹف لینڈ روور جیپ ہے، جس پر ''ایل ای ڈی۔ اٹھہتر'' کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا تھا؟''

میں نے بات ادھوری چھوڑ کر سوالیہ نظر سے حوالدار کی طرف دیکھا تو اس نے جلدی سے کہا۔

''نہیں ملک صاحب! آپ جیپ کے بارے میں بالکل ٹھیک بتا رہے ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''مذکورہ جیپ کا رنگ کیسا ہے؟''

''وہ مٹیالے سے رنگ کی جیپ ہے۔'' حوالدار نے جواب دیا۔ ''آپ اسے خاکی رنگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... اب ایک آخری بات بھی بتا دو۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیا سکندر شاہ خود ہی جیپ ڈرائیو کرتا ہے یا اس کے ساتھ کوئی ڈرائیور وغیرہ بھی ہوتا ہے؟''

''جناب! سکندر شاہ خود ہی ڈرائیو کرتا ہے۔'' حوالدار نے بتایا۔ ''لاہور سے صرف دو افراد جیپ میں بیٹھ کر آتے ہیں۔ ایک سکندر شاہ اور دوسری حاجی کی مبینہ بیٹی صوفیہ۔ صوفیہ، سکندر شاہ کے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھتی ہے۔ واپس میں ان کے ہمراہ جانے والے جوانوں کو جیپ کے عقبی حصے میں بٹھایا جاتا ہے۔''

میں نے اس کے بعد حوالدار جمعہ خان کو چند نصیحتیں کیں اور خاص طور پر اس بات کی تاکید کی کہ جیسے ہی وہ خاکی جیپ بخت نگر سے روانہ ہو، اسے تھانے میں پہنچنا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مجھ سے رخصت ہو گیا۔

جمعہ خان کے جانے کے بعد میں اگلے روز کا پروگرام ترتیب دینے لگا۔

❁.....❁

بخت نگر، قصبہ نور کوٹ سے شمالی سمت میں واقع تھا اور ان دونوں گاؤں کے درمیان لگ بھگ تین میل کا فاصلہ حائل تھا۔ ایک کچا راستہ، تھانے والی نیم پختہ سڑک سے سیدھا بخت نگر کی طرف جاتا تھا۔ اس کچے راستے کی ایک جانب ایک نہر رواں دواں تھی، جبکہ دوسری طرف کھیتوں کا وسیع و عریض سلسلہ پھیلا ہوا تھا، گویا وہ راستہ کچا اور بے ڈھنگا ہونے کے باوجود بھی اپنے مسافروں کو فرحت بخش منظر اور خوش نما فضا فراہم کرتا تھا۔ اس راستے پر سائیکل سوار، گھڑ سوار، تانگا سوار اور پیدل..... ہر طرح کے مسافروں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔

میں نے بالائی سطور میں جس نہر کا ذکر کیا ہے، وہ شمالاً جنوباً بہتی تھی اور نیم پختہ سڑک کے نیچے سے گزر کر زیریں علاقے کو سیراب کرتے ہوئے آگے ہی آگے جنوبی سمت میں بہتی چلی جاتی تھی۔ سڑک کے اس مقام پر ایک پُل بنا ہوا تھا، جہاں سے نہر گزرتی تھی اور میں اس وقت اسی پُل کے قریب موجود تھا۔

وہ عصر اور مغرب کا درمیانی وقت تھا، فضا میں اچھی خاصی تپش موجود تھی۔ عموماً اپریل کی شامیں خاصی خوشگوار ہوا کرتی ہیں لیکن اس سال موسمِ گرما خاصے جلال میں نظر آتا تھا۔ میرے ساتھ اس وقت ایس پی علی نواز گوندل کا ڈرائیور گل داد بھی موجود تھا۔ گل داد دن ہی میں گوندل صاحب کی کار لے کر میرے پاس آ گیا تھا۔ یہ ایک چھوٹی سی فیاٹ کار تھی، جس کا رنگ نیلا تھا۔ ایس پی صاحب کی ہدایت کے مطابق کار کی



نمبر پلیٹ پر سے ''پنجاب پولیس'' کے الفاظ صاف کر دیئے گئے تھے، تاکہ سکندر شاہ کو کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہو۔ گل داد ایک سمجھ دار، تجربہ کار اور چاق و چوبند پولیس اہلکار تھا۔ ایسے مستعد لوگوں کے ساتھ کام کرنے کا مزہ آتا ہے۔''

میں پسنجرز سیٹ پر براجمان تھا اور گل داد خان کار کے ساتھ کچھ ایسے انداز میں مصروف تھا، جیسے اس میں پیدا ہو جانے والا کوئی فالٹ دُور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یہ سب ایک قسم کی اداکاری تھی، تاکہ کسی کو ہمارے بارے میں کوئی شک نہ ہو۔ ہم دونوں اس وقت عوامی لباس میں ملبوس تھے۔ کار کو ایسے زاویے سے کھڑا کیا گیا تھا کہ پسنجر سیٹ سے نیم پختہ سڑک کا وہ مقام بڑا واضح دکھائی دیتا تھا، جہاں پر بخت نگر کی طرف سے آنے والا کچا راستہ آ کر ملتا تھا۔ خاکی جیپ جیسے ہی کچے راستے پر نمودار ہوتی، میری نگاہ میں آ جاتی۔ ہم اسی وقت نیلی فیاٹ کو حرکت میں لے آتے۔ ہماری کوشش یہ ہوتی کہ جب خاکی جیپ جھنگ شہر کی طرف جانے والی نیم پختہ سڑک پر ''قدم'' رکھے تو ہم چند گز کے فاصلے پر اس سے آگے ہوں۔ سکندر شاہ کو یہی محسوس ہو کہ ہم مخالف سمت سے آ رہے تھے اور اب اتفاق سے ان کے آگے ہیں۔ یہ ایک فطری سی سچویشن ہوتی۔ لہٰذا سکندر شاہ کا اس طرف دھیان ہی نہیں جا سکتا تھا کہ ہم ان کا پیچھا پکڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح آگے پیچھے چلتے ہوئے ہم تھانے، تانگا اسٹینڈ اور بس اسٹاپ سے آگے بڑھتے اور جھنگ شہر کی جانب رواں دواں ہو جاتے۔

ہمارے درمیان پہلے ہی یہ بات طے ہو گئی تھی کہ ڈرائیونگ گل داد کرے گا اور میں اس کے پہلو میں پسنجرز سیٹ پر بیٹھ کر مشاہداتی اُونچ نیچ کا باریک بینی سے جائزہ لوں گا۔ گل داد بہت اچھے مزاج کا مالک تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں ہمارے درمیان دوستی کی فضا قائم ہو گئی تھی۔ کسی ایمرجنسی کی صورت میں، ہماری اسٹوری یہ تھی کہ میں، گل داد کا چچا زاد ہوں۔ جو اس سے ملنے کے لئے لاہور سے جھنگ آیا ہوا تھا اور اب اس کے ہمراہ لاہور جا رہا ہوں۔ گل داد مقامی ایس پی صاحب کا ڈرائیور تھا اور اس نے ایک دن کے لئے ایس پی صاحب سے ان کی کار لے لی تھی۔ یہ اسٹوری حقیقت کے قریب اور معمول کے مطابق تھی۔

دھوپ اپنے سنہری، حدت بردار پَر سمیٹنے کو تھی کہ مٹیالے رنگ کی جیپ میری نگاہ

میں آ گئی۔ وہ کچے راستے پر اُچھلتی، دُھول اُڑاتی، بے ہنگم انداز میں نیم پختہ سڑک کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس کی رفتار کچھ زیادہ نہیں تھی، تاہم ناہموار کچا راستہ اس کے مزاج سے لگا نہیں کھاتا تھا اور اس کی بے ترتیب اچھل کود کا سبب بھی یہی تھا۔

میرے گرین سگنل پر گل داد جلدی سے کار کے اندر آیا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اگلے ہی لمحے نیلی فیاٹ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ جب ہم کچی اور نیم پختہ سڑکوں کے ملاپ والے ایک مقام سے چالیس گز آگے پہنچے تو خاکی جیپ بھی نیم پختہ سڑک پر آ گئی۔ میں نے عقبی منظر دکھانے والے آئینے میں نگاہ ڈالی۔ خاکی جیپ مجھے بڑی واضح نظر آئی۔ سب سے پہلے میں نے اس کی نمبر پلیٹ پر دھیان دیا۔ وہاں ایل ای ڈی۔ اٹھہتر۔ لکھا ہوا دکھائی دیا۔ مزید تصدیق اس بات سے ہو گئی کہ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر سکندر شاہ موجود تھا اور اس کے برابر پسنجرز سیٹ پر صوفیہ براجمان تھی۔ حوالدار جمعہ خان نے مجھے ان دونوں کے حلیوں کے بارے میں بڑی وضاحت سے بتا دیا تھا، لہٰذا انہیں پہچاننے میں مجھے کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔

تھوڑی ہی دیر میں تھانہ، تانگہ اسٹینڈ اور بس اسٹاپ کو ہم نے پیچھے چھوڑ دیا۔ ہمارا رخ جھنگ شہر کی جانب تھا۔ گل داد نے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ خاکی جیپ ہمارے تعاقب میں لگی ہوئی ہے۔''

''عملاً ایسا ہی نظر آتا ہے، خان صاحب!'' میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''لیکن جو حقیقت ہے یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔''

گل داد عہدے میں مجھ سے کافی نیچے تھا، لیکن وہ چونکہ ایس پی صاحب کے بہت قریب تھا، لہٰذا میں اسے خاص عزت دے رہا تھا۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے، مگر یہ حقیقت ہے کہ محکمہ جاتی معاملات میں ان چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

''ملک صاحب! میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔'' گل داد نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیسا آئیڈیا، خان صاحب؟''

''کیوں نہ ہم اسی حکمت عملی پر آگے بڑھتے رہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے



بولا۔ ''ہم آگے آگے اور وہ لوگ پیچھے پیچھے۔ اس طرح ایک لمحے کے لئے بھی ان کے ذہن میں یہ خیال نہیں آئے گا کہ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔''

''آئیڈیا اچھا ہے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''لیکن اس پر عمل ایک گھنٹے سے پہلے نہیں ہو سکتا۔''

''وہ کیوں جناب؟'' گل داد ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ کام تو ہم اس وقت بھی جاری رکھے ہوئے ہیں، پھر ایک گھنٹے کی شرط کیوں؟''

''یہ شرط اس لئے ہے کہ ایک گھنٹے بعد ہم جھنگ شہر کے اندر سے نکل کر لاہور جانے والی سڑک پر رواں دواں ہوں گے۔'' میں نے بدستور گہری سنجیدگی سے کہا۔

''ملک صاحب! آپ بجھارتیں نہ ڈالیں۔'' وہ اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''آپ کی بات میری سمجھ میں بیٹھی نہیں۔''

''میں بٹھاتا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''ہماری اطلاعات کے مطابق اس جیپ کو سیدھا لاہور جانا ہے، لیکن یہ کسی حدیث کا لکھا ہوا نہیں ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ جھنگ شہر ہی میں کسی سڑک پر مڑ جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو ہمارے لئے بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس صورت میں لامحالہ ہمیں آناً فاناً میں گاڑی کو روک کر اس کے پیچھے دوڑانا ہو گا، جس میں یقیناً بے احتیاطی بھی ہو گی۔ کیونکہ ہم اس جیپ کو ایک لمحے کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے۔ ہماری کوئی بھی اضطراری حرکت جیپ والوں کو شک و شبہے میں ڈال سکتی ہے۔ پھر ہمارے لئے ان کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہیں رہے گا، لہٰذا.....''

میں ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''لہٰذا جب تک خاکی جیپ جھنگ شہر کی حدود سے نکل کر لاہور جانے والی سڑک پر رواں دواں نہیں ہو جاتی، ہمیں تھوڑا فاصلہ رکھ کر ان کے پیچھے جانا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ انہیں ایک لمحے کے لئے بھی اپنے تعاقب کا احساس نہ ہو۔''

''آپ کی بات نہ صرف میرے دماغ میں بیٹھ گئی ہے، بلکہ میں اس سلسلے میں آپ سے مکمل اتفاق بھی کرتا ہوں، ملک صاحب!'' گل داد نے بڑی رسان سے کہا۔ ''بس جناب! میں نے گاڑی کی رفتار کم کر دی ہے۔''

ہمارے عقب میں آنے والی خاکی لینڈ روور ایک مخصوص رفتار سے آگے بڑھ رہی تھی۔ نیلی فیاٹ کی اسپیڈ کم ہوئی تو وہ تیزی سے قریب آنے لگی۔ پھر ایک لمحہ وہ بھی آیا، جب وہ فیاٹ کو اوورٹیک کرتے ہوئے ہمارے پہلو سے گزر رہی تھی۔

اسی لمحے میں نے بڑی محتاط نظر سے جیپ کے اندر جھانکا۔ جیپ کے پچھلے حصے میں مجھے چار دیہاتی بیٹھے دکھائی دیئے۔ ان کے چہروں پر دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ وہ دہری خوشی سے گزر رہے تھے۔ ایک تو ملک سے باہر جا کر زیادہ سے زیادہ کمانے کا خیال تھا اور دوسرے صوفیہ ایسی طرح دار حسینہ کی قربت کا تصور بھی انہیں نہال کر رہا تھا۔ یہ تصور اور خیال ان کی خوشیوں کو دوبالا، سہ بالا اور..... پتہ نہیں، کون کون سا بالا کر رہا تھا۔

میں نے اسی ایک لمحے میں صوفیہ پر بھی بھرپور نگاہ ڈالی۔ جمعہ خان کی زبان سے میں نے اس کی جو تعریف سنی تھی، وہ اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔ میری نظر میں وہ حُسن و جمال کا جیتا جاگتا شاہکار تھی۔ اگر بخت نگر کے جوان اس کے دیوانے ہو رہے تھے تو اس میں کچھ بھی اچنبھا نہیں تھا۔ وہ ایسی ہی ہستی تھی، جو جوان تو جوان، بوڑھوں کو بھی ٹھنڈی آہیں بھرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ میرے خیال میں حاجی کے سیٹ اپ کا یہ آئٹم سب سے زیادہ مؤثر اور خوش نما تھا۔

میرے اور گل داد کے درمیان ہلکی پھلکی گفتگو کا سلسلہ جاری رہا اور دونوں گاڑیاں آگے پیچھے دوڑتے ہوئے جھنگ شہر میں سے گزر کر لاہور کی جانب بڑھنے لگیں۔ جب ہم نے جھنگ کی آبادی کو پیچھے چھوڑ دیا تو میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔

''گل داد! خاکی جیپ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی اسپیڈ کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اب وہ لوگ لاہور پہنچ کر ہی دم لیں گے، آپ چاہو تو محتاط روی سے اپنی خواہش پوری..... میرا مطلب ہے، اپنے آئیڈیا پر عمل کر سکتے ہیں۔''



''خواہش یا آئیڈیا..... ایک ہی بات ہے، ملک صاحب!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اور جہاں تک محتاط روی کا تعلق ہے، اس سلسلے میں آپ بالکل فکرمند نہ ہوں۔

اور میں واقعی بے فکر ہو گیا۔

جھنگ سے لاہور تک کا فاصلہ اس طرح طے ہوا کہ کبھی ہم خاکی جیپ کے تعاقب میں نظر آتے اور کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ وہ لوگ ہمارا ''پیچھا'' کر رہے ہیں۔

خیریت کے ساتھ ہم لوگ آدھی رات کو لاہور پہنچ گئے۔ گل داد نے تعاقب میں احتیاط جاری رکھی اور نیلی فیاٹ، خاکی لینڈ روور کے پیچھے شادمان کالونی میں داخل ہو گئی۔ پھر جب سکندر شاہ اینڈ کمپنی کی جیپ، نہر کے کنارے واقع ایک کوٹھی کے سامنے رُکی تو ہمیں بھی محفوظ فاصلے پر اپنی کار کو روکنا پڑا۔

گل داد نے اندھیرے کی آڑ لے کر فیاٹ کو ایسے زاویے سے کھڑا کیا تھا کہ ہم تو باآسانی جیپ اور اس کوٹھی کو دیکھ سکتے تھے، لیکن سکندر شاہ وغیرہ ہمیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔ جیپ نے رُکتے ہی مخصوص انداز میں تین مرتبہ ہارن بجایا تو میں چونک اُٹھا۔ یہ کوٹھی کے اندر موجود افراد کو ایک طرح سے کوئی خاص اشارہ دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کوٹھی کی باؤنڈری وال کی جانب میری نگاہ اُٹھی تو میری حیرت گہری تشویش میں بدل گئی۔

کوٹھی کی گیٹ لائٹس آن تھیں اور وہاں سے پھوٹنے والی روشنی نے مذکورہ دیوار کے منظر کو بھی واضح کر رکھا تھا۔ میری تشویش کا باعث اس دیوار پر آویزاں بورڈ تھا، جس پر اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں یہ الفاظ درج تھے۔

''نیو لائف میٹرنٹی ہوم..... نئی زندگی، مرکز زچہ و بچہ۔''

میری طرح گل داد نے بھی اس بورڈ کی تحریر کو پڑھ لیا تھا۔ اس کی حیرت میں ڈوبی ہوئی آواز میری سماعت تک پہنچی۔

''ملک صاحب! یہ جوان بیرونِ ملک جانے کے لئے یہاں پہنچے ہیں یا نئی زندگیوں کو جنم دینے؟''

''ابھی پتہ چل جائے گا، خان صاحب!'' میں نے گمبھیر انداز میں کہا۔

وہ بولا۔

''مجھے تو کوئی سنگین نوعیت کی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔'' وہ متوحش نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''جیپ والوں کا رویہ بھی عجیب سا ہے..... جیپ میں سے کوئی باہر کیوں نہیں نکل رہا؟''

واقعی، جیپ تین بار مخصوص انداز میں ہارن بجانے کے بعد خاموش کھڑی تھی۔ نہ تو اس میں سے کوئی نیچے اُترا تھا اور نہ ہی کوٹھی کے اندر سے کوئی آیا تھا۔ ہارن کا سگنل تو یہی بتاتا تھا کہ کوٹھی میں ہی سے کوئی نمودار ہوگا۔

میں نے گل داد کی وحشت کے جواب میں کہا۔

''خان صاحب! اگر گڑبڑ سنگین نوعیت کی نہ ہوتی تو ہمیں یوں آدھی رات کو جھنگ سے یہاں نہ آنا پڑتا۔ جہاں تک جیپ اور جیپ والوں کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مجھے دو سو فیصد یقین ہے کہ جیپ کے استقبال کے لئے کوٹھی کے اندر سے کوئی ضرور باہر آئے گا۔''

ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر کوٹھی کا گیٹ کھلا۔ اگلے ہی لمحے دو ہٹے کٹے افراد باہر نکلے، پھر بڑی فرمانبرداری سے جیپ کی سمت بڑھ گئے۔ وہ سکندر شاہ کی طرف پہنچے، اس سے کچھ بات کی۔ میں ان کے درمیان ہونے والی گفتگو تو نہیں سن سکتا تھا، البتہ مجھ کو یہ اندازہ ضرور تھا کہ وہ سکندر شاہ سے کسی قسم کی ہدایات لے رہے ہوں گے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی۔

وہ دونوں ملازم صورت ہٹے کٹے شخص سکندر شاہ کے پاس سے ہٹے اور جیپ کے عقبی حصے والا دروازہ کھول لیا۔ اس کے بعد ہماری آنکھوں نے جو منظر دیکھا، وہ ناقابلِ یقین اور حیرت آفرین تھا۔ حاجی یا سکندر شاہ کی جانب سے کسی بھی شر کی توقع کی جاسکتی تھی، لیکن وہاں جو کچھ دیکھنے کو ملا، اس کی اُمید بہرحال مجھے بالکل نہیں تھی۔

ان دونوں صحت مند ملازموں نے ایک ایک نوجوان کو باری باری جیپ سے باہر نکال کر کوٹھی کے اندر پہنچانا شروع کر دیا۔ جس طرح وہ جوانوں کو سنبھال کر اور سہارا دے کر چلا رہے تھے..... بلکہ گھسیٹ رہے تھے، اس سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ جوان اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہیں۔ یقیناً جھنگ سے لاہور کی طرف آتے



ہوئے کسی وقت انہیں بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ راستے بھر میری اس خاکی جیپ پر نظر رہی تھی۔ اس بات کا مجھے اندازہ تھا کہ رات میں کہیں ان کے ساتھ یہ اتنا غفلیلی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔ اب یہی ہوسکتا تھا کہ جھنگ سے روانہ ہوتے وقت انہیں کوئی ایسی شے کھلا دی گئی ہو، جس کے مکمل اثرات چار پانچ گھنٹے بعد ظاہر ہوتے ہوں۔

سفر کے دوران ہماری نیلی فیاٹ نے تین چار مرتبہ خاکی جیپ کو اوورٹیک بھی کیا تھا، لیکن میں ان لمحاتی اوقات میں جیپ کے پچھلے حصے میں جھانکنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ اس کا سبب ایک تو رات کا وقت تھا اور دوسرے جیپ کے پچھلے حصے پر تاریکی کی حکمرانی نظر آئی تھی۔ اس وقت میں نے اس پراسرار اندھیرے کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا۔ یہی اطمینان تھا کہ وہ جیپ راستے میں کہیں رُکی نہیں اور یہ کہ ہمارے تمام مطلوبہ افراد اس کے اندر موجود ہیں۔ اب اس تاریکی کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔ بہرحال اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

ایک ایک کر کے چاروں جوان کوٹھی کے اندر ''غائب'' ہو گئے تو گل داد کی سرسراتی ہوئی آواز میری سماعت سے ٹکرائی

''ملک صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے، جناب؟''

''بھئی، کیا ہو رہا ہے.....'' میں نے کوٹھی کے گیٹ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔ ''خان صاحب! آپ ماشاء اللہ سمجھ دار آدمی ہیں۔ یہ بات تو آپ کو اچھی طرح پتہ ہوگی کہ جب کسی کو سہارا دے کر میٹرنٹی ہوم میں لایا جاتا ہے تو پھر کیا ہوتا ہے۔ یا تو کاکا..... یا پھر کاکی!''

''ملک صاحب! ایسی سنگین صورتِ حال میں آپ کو مذاق کی سوجھ رہی ہے۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ جس ''کسی'' کی بات کر رہے ہیں نا، وہ کوئی عورت ہوتی ہے... حاملہ عورت، جس کی زچگی سر پر آ جاتی ہے۔ اور یہ تو چاروں گبرو جوان ہیں۔ آپ ان سے ویسے نتائج کی اُمید تو نہ رکھیں جناب!''

اسی لمحے خاکی جیپ حرکت میں آ گئی۔ یہ اچھا ہوا کہ وہ پیچھے مڑنے کے بجائے آگے کی جانب بڑھی تھی۔ اگر وہ واپسی کی راہ اختیار کرتی تو اس کے قوی امکانات تھے

کہ ہماری نیلی فیاٹ ان کی نگاہ میں آ جاتی۔ اور اگر جھنگ سے لاہور تک راستے میں سکندر شاہ نے کسی حوالے سے ہماری گاڑی کو کوئی اہمیت دی تھی تو اس مرحلے پر ہمارے لئے بڑی مشکل ہو جاتی۔ بہرحال، اللہ جو بھی کرتا ہے اس میں اس کی کوئی مصلحت ضرور پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ مصلحت انسان کی سمجھ میں بھی آ جائے، قطعی ضروری نہیں..... جبھی بڑے بزرگ اور جہاں دیدہ تجربہ کار لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کی رضا میں راضی رہنا چاہئے۔''

میرے اشارے پر گل داد نے بہ احتیاط نیلی فیاٹ کو خاکی لینڈ روور کے پیچھے ڈالا تو میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ ''میٹرنٹی ہوم'' والی بات تو میں نے واقعی مذاقاً کہی تھی۔ بہرحال اب دیکھنا یہ ہے کہ سکندر شاہ اور صوفیہ کے مشن کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔''

''دیکھتے ہیں جناب!'' گل داد نے مبہم سے لہجے میں کہا۔

جب ہماری گاڑی میٹرنٹی ہوم والی کوٹھی کے سامنے سے گزری تو میں نے کوٹھی کے گیٹ کے پہلو میں لگی نیم پلیٹ کو بہ غور دیکھا۔ اس تختی پر لکھا تھا۔

''صمد ہارون، سی۔ الیون، شادمان کالونی۔'' میں نے اس ایڈریس کو اپنی یادداشت میں محفوظ کر لیا۔

اس مرتبہ لینڈ روور نے ہمیں زیادہ زحمت نہیں دی اور ایک دو سڑکوں پر گھومنے کے بعد کینال پارک کی طرف آ گئی۔ پھر ہم نے اسے کینال پارک کی ایک کوٹھی کے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ ہم محدود اور محتاط فاصلہ رکھ کر جیپ کا تعاقب کر رہے تھے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کینال پارک والی متذکرہ کوٹھی کا گیٹ پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا، جیسے اس کوٹھی کے مکینوں کو پیشگی یہ اطلاع دے دی گئی ہو کہ چند لمحات میں صوفیہ اور سکندر شاہ وہاں پہنچنے والے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ یہ اطلاع نیو لائف میٹرنٹی ہوم والوں نے یہاں پہنچائی ہو، ٹیلی فون وغیرہ کے ذریعے۔ بہرحال جیسے ہی خاکی جیپ اس کوٹھی میں داخل ہوئی، ایک شخص نے گیٹ بند کر دیا۔ وہ شخص اس کوٹھی کا چوکیدار بھی ہو سکتا تھا اور کوئی ادنیٰ سا ملازم بھی۔

ہم لگ بھگ دس منٹ تک وہیں کھڑے یہ انتظار کرتے رہے کہ شاید اس کوٹھی



سے کوئی برآمد ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جس کا ایک ہی مطلب تھا کہ صوفیہ اور سکندر شاہ، رات کا باقی حصہ اس کوٹھی میں گزاریں گے۔

گل داد نے مجھ سے پوچھا۔ ''ملک صاحب! اب کیا پروگرام ہے؟''

''آپ اس کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے گاڑی کو آگے لے چلیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پھر کوئی پروگرام بناتے ہیں۔ صوفیہ اور سکندر شاہ تو صبح تک کوٹھی سے باہر نہیں نکلیں گے اور ادھر میٹرنٹی ہوم میں ''داخل'' ہونے والے چار جوانوں کو بھی صبح سے پہلے باہر لائے جانے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا۔''

گل داد نے میری ہدایت کی تکمیل کر دی۔ کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے وہاں نصب نیم پلیٹ کے مندرجات کو ذہن نشین کر لیا۔ نیم پلیٹ پر کچھ یوں تحریر تھا۔

چیمہ ہاؤس..... چوبیس۔ کینال پارک۔''

چیمہ ہاؤس، صمد ہارون، نئی زندگی مرکز زچہ و بچہ کا بہ ظاہر حاجی برکت علی رحمت علی، صوفیہ، سکندر شاہ اور ریکروٹنگ بزنس سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن اس بات کی بھی کوئی گارنٹی نہیں تھی کہ حاجی نے اپنا اور اپنے متعلقین کا درست نام بتایا ہو۔ ہو سکتا ہے، ناموں کے بارے میں حاجی نے غلط بیانی سے کام لیا ہو۔ یہ نکتہ اپنی جگہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔

گل داد مختلف سڑکوں پر سے گھومتے ہوئے نیلی فیاٹ کو نہر کے قریب لے آیا اور ایک درخت کے نیچے روک دیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ ہم جس سڑک پر کھڑے تھے، وہاں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ گل داد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! اب بتائیں، کیا کرنا ہے؟''

''ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

اس وقت میرا ذہن گہری سوچ بچار میں مصروف تھا اور میری یہ خاموشی گل داد کی بے تابی میں گراں قدر اضافہ کر رہی تھی۔ وہ اضطراری لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! آثار سے تو یہی نظر آ رہا ہے کہ دونوں کوٹھیوں میں جانے والے اب صبح سے پہلے باہر قدم نہیں نکالیں گے، لہٰذا ہمیں چاچا کے گھر جا کر سو جانا چاہئے۔ جو بھی ہوگا، صبح دیکھا جائے گا۔''

''لیکن میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا، گل داد خان!'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

گل داد کے چاچا شکور حسین کا گھر لاہور کے ایک معروف علاقے ''اچھرہ'' میں تھا۔ گوندل صاحب نے بھی مجھے یہی صلاح دی تھی کہ بہ وقت ضرورت میں شکور حسین کے گھر پر قیام کر سکتا ہوں۔ لیکن تھوڑی دیر پہلے میں نے یہاں کے جو حالات دیکھے تھے، ان کی روشنی میں کسی قیام یا طعام کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی تھی۔ یہ بہت ہی غیر یقینی اور انتہائی نازک صورتِ حال تھی۔ عارف، حامد، مشتاق اور فرقان کو جس حالت میں شادمان والی کوٹھی کے اندر لے جایا گیا تھا، وہ انتہائی تشویش ناک تھا۔ ظاہر ہے، ان سے پہلے یہاں پہنچنے والے رفیق، اشرف اور جاوید کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا ہوگا۔ وہ لوگ بھی نصف شب ہی کو لاہور پہنچے ہوں گے۔ اگر حاجی اینڈ کمپنی واقعی بردہ فروشی ایسے مذموم کاروبار میں ملوث تھی تو پھر یہ بات یقینی تھی کہ ان ''بردوں'' کو اسی ''نئی زندگی مرکز زچہ و بچہ'' سے کہیں آگے ''بھیجا'' جاتا ہوگا۔ ایک معزز پیشے کی آڑ میں کیسا گھناؤنا کھیل، کھیلا جا رہا تھا.....!

گل داد میری بات سن کر چونکا اور معنی خیز لہجے میں بولا۔

''گویا.....تو آپ رات ہی رات میں کوئی کارروائی ڈالنا چاہتے ہیں؟''

''تمہارے صاحب کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے پہلے ہی مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ یہاں آ کر مجھے کسی قسم کی کوئی کارکردگی دکھانے کی ضرورت نہیں، بلکہ جو بھی صورتِ حال ہو، اس کے بارے میں، میں انہیں آگاہ کروں۔ وہ اس سلسلے میں جو مناسب سمجھیں گے، وہی قدم اُٹھائیں گے.....اور وہ بالکل صحیح سوچ رہے تھے۔ وہ میرے افسر ہیں، میں اپنے تھانے کی حدود سے باہر کسی نوعیت کی کارروائی کا مجاز نہیں ہوں اور اپنے افسر کے حکم کی تعمیل کرنا بھی میرے فرائض میں شامل ہے۔''

''پھر.....پھر.....'' وہ متذبذب آواز میں بولا۔ ''آپ کوئی کارروائی بھی



نہیں کرنا چاہتے اور صبح کا انتظار کرنے کا بھی ارادہ نہیں..... پھر کیا سوچا آپ نے؟''

''فوری واپسی۔'' میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

''یعنی ہم واپس جھنگ جائیں گے؟'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''ابھی اور اسی وقت؟''

''بالکل، میرا یہی مطلب ہے۔'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''اگر آپ گاڑی کو دوڑانا جانتے ہیں تو اِن شاء اللہ! سورج طلوع ہونے سے پہلے ہم ایس پی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔ میں یہاں کی گڑبڑ صورتِ حال فوری طور پر گوندل صاحب کے علم میں لانا چاہتا ہوں، تاکہ جب تک چیمہ ہاؤس اور نئی زندگی مرکز زچہ و بچہ کے مکین بیدار ہوں، گوندل صاحب لاہور پولیس سے رابطہ کر کے کوئی تسلی بخش کارروائی ڈالنے کا بندوبست کر دیں۔ آپ میری بات تو سمجھ ہی گئے ہوں گے، خان صاحب؟''

اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بڑی سرعت سے نیلی فیاٹ کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔

''گاڑی کو تو صرف ''ایڑ'' لگانے کی ضرورت ہے۔ یہ خود بہ خود دوڑنا شروع کر دے گی۔ جلد از جلد صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کا کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

اگلے ہی لمحے نیلی فیاٹ، ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہم کینال پارک، شادمان کالونی، جیل روڈ اور فیروز پور روڈ سے گزر کر شہر سے باہر جانے والے راستے کو ناپنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم دریائے راوی کا پُل عبور کر رہے تھے۔

میں نے گل داد سے استفسار کیا۔

''خان صاحب! گاڑی میں فیول کی کیا پوزیشن ہے؟ یہاں شاہدرہ ٹاؤن کے قریب ہی ایک پٹرول پمپ ہے، اگر کوئی کمی بیشی ہو تو پوری کر لیں، واپسی کے راستے میں کوئی مسئلہ نہیں کھڑا ہونا چاہئے۔''

اس نے تسلی بخش لہجے میں جواب دیا۔

''ملک صاحب! گاڑی کی ٹینکی میں اتنا پٹرول ہے کہ ہم با آسانی جھنگ پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن آپ کے اطمینان کے لئے میں پھر بھی اس پٹرول پمپ سے ٹینکی فُل کروا لیتا ہوں۔''

''عقل مندی کا تقاضا یہی ہے گل داد!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''موت، گاہک اور مصیبت دستک دے کر نہیں آتی۔ یہ انسان کی بے خبری میں شب خون مار کر اس کے اندازوں کی ایسی کم تیسی کر دیتی ہیں۔ اس لئے کسی بھی مشن کے دوران ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔''

ہم نے مذکورہ فلنگ اسٹیشن سے گاڑی میں پٹرول بھروایا اور نیلی فیاٹ ویران، سنسان سڑک پر تاریکی اور سناٹے کو چیرتے ہوئے جھنگ کی سمت فراٹے بھرنے لگی۔

واپسی کی راہ میں ہمارے درمیان زیادہ تر گمبھیر خاموشی ہی حائل رہی اور اگر کوئی بات ہوئی بھی تو موضوع ''نیو لائف میٹرنٹی ہوم'' اور وہاں پہنچائے جانے والے بخت نگر کے بدبخت چار جوانوں تک ہی محدود رہا۔ نیلی فیاٹ گویا جیٹ طیارہ بن گئی تھی!

جب ہم نے جھنگ کی حدود کو چھوا تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

❁.....❁

ایس پی علی نواز گوندل صاحب کو میں نے سوتے سے جگوایا تو اُنہیں صورتِ حال کی سنگینی کا فوراً احساس ہو گیا۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ وہ مجھے سننے کے لئے بے چین نظر آ رہے تھے۔ میں نے اپنی کارکردگی پوری تفصیل کے ساتھ ان کے گوش گزار کر دی۔ ان کے چہرے اور آنکھوں میں تشویش کے سائے لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ انہوں نے میری باتوں کو پوری توجہ اور گہری سنجیدگی سے سنا۔ میں نے انہیں لاہور میں واقعی دونوں مشکوک کوٹھیوں کی ساخت، رنگ اور ایڈریس سے آگاہ کیا۔ کینال پارک والے چیمہ ہاؤس اور شادمان والے نیو لائف میٹرنٹی ہوم کا ایڈریس انہوں نے نوٹ کر لیا۔ میں خاموش ہوا تو انہوں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''صفدر حیات! تم نے اپنے فرائض سے بڑھ کر کارنامہ انجام دیا ہے۔ اب یہاں سے میرا کام شروع ہوتا ہے۔ سمجھو کہ میں ابھی سے حرکت میں آ گیا ہوں۔ میں پہلی



فرصت میں اپنے آفیسرز سے رابطہ کر کے انہیں تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں.....وہ بھی پورے پس منظر کے ساتھ۔''

''سر! سی۔ ایون شادمان کالونی کی کوٹھی میں جو چار جوان پہنچائے گئے ہیں، ان کی حالت تشویش ناک ہے۔ کہیں ان کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو جائے۔''

میری پریشانی کو دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا۔

''صفدر حیات! تمہیں ان چار افراد کے لئے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان کی حفاظت اور سلامتی اب میری ذمے داری ہے۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے ممنونیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''سر! ان چار نوجوانوں سے پہلے بھی حاجی، بخت نگر کے تین لڑکوں کو لاہور روانہ کر چکا ہے، جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا بھی تھا۔''

''ان کو بھی دیکھ لیں گے۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے تسلی آمیز لہجے میں بولے۔ ''تم یہ سارا معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔''

''ٹھیک ہے سر!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنے اطمینان کے لئے پوچھ لیا۔ ''سر! پچھلی ملاقات میں ہمارے درمیان بردہ فروشی کے مذموم کاروبار پر خاصی تفصیلی بات ہوئی تھی، کہیں یہ اسی سلسلے کی کڑی تو نہیں؟''

''زیادہ امکان تو اسی بات کا نظر آ رہا ہے، صفدر حیات!'' وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ''صحیح صورتِ حال کا اندازہ، لاہور پولیس کی تفتیش کے بعد ہی ہو گا۔''

''میرے لئے کیا حکم ہے سر؟'' میں نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

''تم فوراً اپنے تھانے میں پہنچو۔'' وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ ''گل داد تمہیں گاڑی میں تھانے تک پہنچا دے گا۔ ''حاجی لمبے چوڑے نام'' پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورتِ حال میں حاجی کا پولیس کی دسترس میں رہنا بہت ضروری ہے۔ اور میں تمہاری ڈیوٹی لگاتا ہوں کہ حاجی کو کہیں اِدھر اُدھر نہیں ہونا چاہئے۔ اِن شاء اللہ! آج شام تک لاہور کی صورتِ حال بھی واضح ہو جائے گی۔''

وہ لمحے بھر کے لئے متوقف ہوئے، ایک گہری سانس خارج کی اور میرے

چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولے۔

''صفدر حیات! میں جانتا ہوں، تم نے ساری رات بے آرامی میں جاگ کر گزاری ہے، تھکن اور نیند میں اس وقت تمہارا برا حال ہوگا، لیکن فرائض کا تقاضا یہ ہے کہ تمہیں تھوڑی تکلیف اور اُٹھانا ہوگی۔''

''آپ حکم کریں سر!'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں فرض کی راہ میں ہر تکلیف، ہر پریشانی جھیلنے کو تیار ہوں۔''

''مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔'' وہ ستائشی لہجے میں بولے۔ ''صرف اتنا کرو کہ آج کے دن آرام اور نیند کا بائیکاٹ کر دو، شام تک تمہیں چاق و چوبند رہنا ہے۔''

''اوکے سر! میں آپ کے حکم کی تعمیل کروں گا۔'' میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

''آپ میری طرف سے بالکل مطمئن ہو جائیں۔''

''ٹھیک ہے، اب تم فوراً یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ گل داد تمہیں تھانے پہنچا دے گا۔'' میں نے ایس پی صاحب کو سلیوٹ کیا اور نیلی فیاٹ میں بیٹھ کر اپنے تھانے، واقع نورکوٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

❁.....❁

جمعہ خان کو اُمید نہیں تھی کہ میں اتنی جلد لاہور سے واپس لوٹ آؤں گا۔ میں نے تھانے میں قدم رکھتے ہی اس سے کہا۔

''جمعہ خان! جلدی سے ناشتے پانی کا بندوبست کرو۔ ہمیں ابھی ایک اور مشن کے لئے نکلنا ہے۔''

کل شام نورکوٹ سے روانہ ہوتے وقت میں نے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیا تھا۔ جب سے اب تک کھانے کے نام پر کچھ بھی پیٹ کے اندر نہیں اُترا تھا۔ گزشتہ رات اتنی سنسنی خیز اور تشویش ناک تھی کہ کہیں رُک کر کچھ کھانے پینے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

حوالدار نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! خیریت تو ہے نا؟ وہاں لاہور میں کیا حالات ہیں؟ اور..... ابھی ہمیں کس مشن کے لئے نکلنا ہے؟''



''جمعہ خان!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لاہور کے حالات اور وہاں پیش آنے والے واقعات کے بارے میں، میں تمہیں راستے میں تفصیل سے بتاؤں گا۔ فی الحال تم پیٹ پوجا کا انتظام کرو، تاکہ پوری توانائی کے ساتھ بخت نگر کا رُخ کیا جا سکے۔''

''بخت نگر.....'' اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھا۔ ''مگر کس سلسلے میں؟''

''حاجی ایرا وغیرہ کی گرفتاری کے سلسلے میں۔''

''اوہ.....!'' وہ ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے اسے مزید کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں دیا اور کھڑے کھڑے ناشتہ لینے بھیج دیا۔ اس کام میں اس نے بھی کمال پھرتی کا مظاہرہ کیا اور ٹھیک پندرہ منٹ کے بعد وہ ناشتے کے ساتھ واپس لوٹ آیا۔ تھانے کے قریب ہی بس اسٹاپ واقع تھا، جہاں کھانے وغیرہ کے بھی دو تین چھوٹے ہوٹل تھے، لہٰذا جمعہ خان کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

کچھ دیر کے بعد میں اور حوالدار جمعہ خان ایک تانگے پر سوار ہو کر بخت نگر کی طرف جا رہے تھے۔ بس اسٹاپ کے سامنے ہی نیم پختہ سڑک کی دوسری جانب تانگا اسٹینڈ تھا۔ حوالدار ناشتے کے ساتھ ہی ایک تانگا بھی پکڑ لایا تھا۔

نورکوٹ سے بخت نگر پہنچنے کے دوران میں، میں نے حوالدار کو ان تمام حالات سے آگاہ کر دیا، جنہوں نے اس کے رگ و پے کو ایک سنسنی خیز تجسس میں جکڑ رکھا تھا۔ میری طرح اس کا بھی یہی خیال تھا کہ حاجی کو فوراً گرفتار کر لینا چاہئے۔ لاہور پولیس اپنی تحقیق اور تفتیش سے جو بھی نتیجہ اخذ کرے گی، اس کی روشنی میں حاجی کی گرفتاری عمل میں لانا ضروری ہو جائے گی۔

جمعہ خان کا دھیان بھی میری طرح بردہ فروشی کی طرف جا رہا تھا اور یہ گھناؤنا کاروبار ایک معزز پیشے کی آڑ میں ہو رہا تھا۔ میں نے اس میٹرنٹی ہوم والی کوٹھی کی نیم پلیٹ پر ''صمد ہارون'' کا نام لکھا دیکھا تھا۔ وہ میٹرنٹی ہوم اگر واقعی کسی صمدن ہارون کا تھا تو پھر اس کا صاف صاف یہی مطلب تھا کہ وہ بھی حاجی اینڈ کمپنی کے دھندے کا ایک حصہ تھا۔ بہرحال اب وہ وقت دور نہیں تھا، جب حاجی برکت علی رحمت علی کی

اصلیت کھل کر سامنے آ جاتی اور میں ان انکشاف انگیز لمحات کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

بخت نگر میں جمعہ خان کی سسرال تھی اور وہ وہاں کی ایک ایک گلی سے ایسے ہی واقف تھا، جیسے انسان اپنے ہاتھ کی اُنگلیوں سے آشنا ہوتا ہے۔ ہمارا تانگا بخت نگر کی حدود میں داخل ہوا تو جمعہ خان نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! اب کیا حکم ہے؟''

وہ تانگے کی اگلی سیٹ پر کوچوان کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا، جبکہ میں عقبی سیٹ پر موجود تھا۔ وہ چونکہ کوچوان کو گائیڈ کر رہا تھا، لہٰذا اس کے استفسار کا مطلب یہی تھا کہ تانگا کہاں رُکوایا جائے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ دن کے گیارہ، ساڑھے گیارہ بجے تھے، لیکن تپش ایسی تھی کہ گویا سورج سوا نیزے پر آ گیا ہو۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

''جمعہ خان! امتیاز جٹ نے اپنا جو مکان کرائے پر دے رکھا ہے، کیا وہاں تک تانگا لے جانا ممکن ہے؟''

''بالکل، ممکن ہے جناب!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''امتیاز جٹ کے مکان کے دروازے تک تانگا جا سکتا ہے۔''

''اور تمہارے خیال میں امتیاز جٹ کا کرائے دار اس وقت گھر کے اندر موجود ہو گا؟''

''مجھے یقین ہے، وہ ہمیں گھر ہی میں ملے گا۔'' جمعہ خان نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ ''ظہر کی نماز کے لئے وہ لگ بھگ ایک بجے مسجد کی طرف جاتا ہے۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''ہم سیدھے اسی کے پاس جا رہے ہیں۔''

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہمارا تانگا حاجی برکت علی رحمت علی کی رہائش گاہ کے سامنے جا کر رکا۔ ہم دونوں تانگے سے نیچے اُتر آئے۔ حوالدار جمعہ خان اس وقت یونیفارم میں تھا، جبکہ میں نے عوامی لباس پہنا ہوا تھا۔ جمعہ خان نے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ میں اس سے چند قدم پیچھے کھڑا ہو گیا۔



ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پہلی ہی دستک پر دروازہ کھل گیا اور کھلے ہوئے دروازے میں حاجی سیاہ کرتوت کا مکروہ چہرہ نمودار ہوا۔ میں اسے پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ جمعہ خان کی زبان سے نکلنے والے جملے نے مجھے بتا دیا کہ وہ حاجی برکت علی رحمت علی ہی ہے۔

''السلام علیکم، حاجی صاحب!'' حوالدار نے بڑی عقیدت مندی سے کہا۔

حاجی نے اس کے سلام کا جواب دینے سے پہلے تنقیدی نظر سے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور پھر جمعہ خان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔

''وعلیکم السلام!.....حوالدار جی! خیریت تو ہے؟''

''حاجی صاحب! میں خادم حسین کا ایک مسئلہ لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔'' جمعہ خان نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کہا۔ یہ ساری پلاننگ ناشتے کے دوران ہی ہم نے تیار کر لی تھی۔ جمعہ خان جو بھی کر رہا تھا، اس میں میری تائید شامل تھی۔

حاجی نے ایک مرتبہ پھر جائزہ نگاہ سے میری طرف دیکھا اور کہا۔

''خادم حسین اسی بندے کا نام ہے نا؟''

''جی.....جی ہاں۔'' حوالدار نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

''آپ لوگ اندر آ جائیں۔'' وہ یہ کہتے ہوئے مڑ گیا۔

ہم گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ حوالدار کی زبانی مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ امتیاز جٹ کا وہ گھر تین کمروں پر مشتمل تھا۔ دو کمرے عقبی حصے میں بنے ہوئے تھے اور ایک آگے، جو بیٹھک کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ حاجی ہمیں اسی بیٹھک نما کمرے میں لے آیا۔ یہ اچھی بات تھی کہ وہ مجھے تھانہ انچارج کی حیثیت سے پہچان نہیں سکا تھا، ورنہ وہ فوراً بدک جاتا اور ہمیں اتنی آسانی سے گھر کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دیتا۔

حاجی کی عمر کا اندازہ میں نے پچاس کے قریب لگایا۔ وہ صحت مندی کے مروّجہ پیمانوں سے کہیں بڑھ کر صحت مند اور توانا تھا۔ اس کے لئے ہٹا کٹا کے الفاظ بھی بے وزن محسوس ہوتے تھے۔ اس کی توند کسی مٹکے کے مانند باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ رنگت گہری سانولی اور خود کو معزز اور نیک ظاہر کرنے کے لئے اس نے خاصی تگڑی داڑھی بھی رکھ

چھوڑی تھی۔ اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر متاثر کن نہیں بلکہ بیزار کن تھا۔ وہ اپنی چکنی چپڑی اور منافقانہ باتوں سے بخت نگر کے سادہ مزاج افراد کو بہ آسانی بے وقوف بنا رہا تھا۔

ہم بیٹھ چکے تو حاجی نے خاصی کراری آواز میں کہا۔ اس کا مخاطب جمعہ خان تھا۔

''حوالدار جی! وہ آپ کا سالا شمشاد احمد کئی مرتبہ میرے پاس آ چکا ہے۔ وہ بہ ضد ہے کہ میں اسے کام کاج کے لئے سعودی عرب بھیج دوں۔ لیکن وہ میرے معیار پر پورا نہیں اُترتا، مجھے یقین ہے صوفیہ اسے دیکھتے ہی بغیر انٹرویو لئے فیل کر دے گی۔ اُدھر سعودیہ میں محنت مزدوری آسان کام نہیں۔ صرف جوان خون ہی اس مشقت کا سامنا اور مقابلہ کر سکتا ہے۔ شمشاد کی عمر چالیس سے آگے بڑھ چکی ہے اور وہ فیملی والا بھی ہے۔'' وہ لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''حوالدار جی! آپ خاصے سمجھ دار ہو، اپنے سالے کو بھی تھوڑی عقل دے دیں۔''

''ٹھیک ہے حاجی صاحب!'' حوالدار نے مصلحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں شمشاد کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

میں حاجی کے فلسفے تک آسانی سے پہنچ گیا۔ یقیناً جوان اور صحت مند بردوں کی اچھی قیمت ملتی ہوگی اور ادھیڑ عمر کو اونے پونے داموں خریدا جاتا ہوگا۔

حاجی نے ایک مرتبہ پھر قصاب کی نظر سے میرے بدن کا جائزہ لیا اور جمعہ خان سے کہا۔

''حوالدار جی! یہ خادم حسین بھی عرب ممالک کی گرمی اور مشقت کے آگے ٹھہر نہیں سکے گا۔ میرا خیال ہے، تمہیں شمشاد کے ساتھ اسے بھی سمجھانا ہوگا۔''

''نہیں حاجی صاحب! یہ دوسرا کیس ہے۔'' جمعہ خان نے جلدی سے کہا۔

''دوسرا کیس؟'' حاجی چونکا۔ ''کیا مطلب، حوالدار جی؟''

''حاجی صاحب! یہ خادم حسین آپ کو اپنے ساتھ نور کوٹ لے جانے آیا ہے۔'' جمعہ خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ادھر اس کے گھر میں کوئی گڑبڑ ہے۔ رکھی ہوئی چیزیں خود بہ خود اپنی جگہ سے غائب ہونے لگتی ہیں۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ آپ اللہ والے اور ایک نیک انسان ہیں، اس کے گھر پر کوئی دم وغیرہ پھونک دیں گے تو یہ



پُراسرار مسئلہ حل ہو جائے گا۔ دراصل خادم حسین میرا گہرا دوست ہے۔ کہنے لگا کہ میں اس کے ساتھ چلوں اور آپ سے سفارش بھی کر دوں، سو میں چلا آیا۔''

''اچھا، اچھا..... یہ بات ہے۔'' حاجی گردن کو اثباتی جنبش دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

کوشش ان معنوں میں کہ گردن اس کا ''کہنا'' ماننے کو پوری طرح تیار نہیں تھی۔ وہ اس قدر چربیلی ہو چکی تھی کہ اگر حاجی کو گردن کی آنکھ سے دیکھا جاتا تو وہ کسی مرکھنے بیل یا سرکاری سانڈ سے کم نظر نہیں آتا تھا۔

حوالدار نے لوہا گرم دیکھا تو ایک اور چوٹ لگا دی۔

''حاجی صاحب!'' اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ''آپ کی شہرت بخت نگر سے نکل کر خوشبو کی طرح اُدھر ہمارے علاقے نور کوٹ بھی پہنچ چکی ہے اور درجنوں جوان بیرونِ ملک جانے کے لئے پَر تول رہے ہیں۔ قصبہ نور کوٹ، بخت نگر سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ خادم حسین کا گھر دیکھنے کے بہانے اس علاقے کا سروے بھی کر لیں جناب! میرا خیال ہے، آپ کی مصروفیت کے لئے وہاں اچھا خاصا کام نکل آئے گا۔''

یہ تجویز نما مشورہ حاجی کے دل کو لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شیطانی چمک اُبھرتے دیکھی۔ وہ قدرے خوش گوار لہجے میں بولا۔

''حوالدار جی! ہم آپ کی سفارش کو کیسے رد کر سکتے ہیں؟''

''جناب! تانگا ہم اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔'' جمعہ خان نے کہا۔ ''آپ جتنی جلدی جائیں گے، اتنی ہی جلدی واپس بھی آ جائیں گے..... یہی تانگا آپ کو چھوڑنے بھی آئے گا۔''

وہ ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

میں اگر چاہتا تو بخت نگر پہنچتے ہی آناً فاناً حاجی برکت علی رحمت علی کو گرفتار کر لیتا۔ کوئی اس کام سے مجھے روک نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں اس عیار اور مکار بلکہ شیطان صفت شخص سے بڑا سنگین مذاق کرنا چاہتا تھا۔ وہ خوشی خوشی نور کوٹ کے گبرو جوانوں کو دیکھنے جا رہا تھا تاکہ ان کی بردہ فروشی سے اپنی آمدنی کا تخمینہ لگا سکے۔ اور جب میں اچانک اُسے حوالات میں دھکیل کر دروازے پر آہنی تالا ڈلوا دیتا تو اس پر حیرت، غصے، بے

عزتی اور توہین کے غیر متوقع پہاڑ ٹوٹ پڑتے۔ ان لمحات میں اس کی ذہنی، قلبی اور جسمانی کیفیت کا نظارہ بڑا عبرت ناک اور محظوظ کن ہوتا۔ اس نے معصوم اور سادہ لوح افراد کو اپنے مکروہ ڈرامے کا بے بس اور لاچار کردار بنا رکھا تھا، لہٰذا اس پر لازم تھا کہ مکافاتِ عمل کے تحت وہ میرے لکھے ہوئے ڈرامے میں بھی کام کرتا۔ عین اس اسکرپٹ کے مطابق جو میرے ذہن نے اس کے لئے تخلیق کیا تھا۔

میں اس منظر سے پوری طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا، جب حاجی پر یہ خبر آسمانی بجلی کی طرح گرتی کہ اسے بڑی خوب صورتی سے گرفتار کر لیا گیا ہے، وہ جوانوں کو بردے بناتا آیا تھا، میں اسے حوالاتی بنا کر اگلی پچھلی ساری کسر نکال دیتا۔''

ہم بہ خیر و عافیت بخت نگر سے نور کوٹ پہنچ گئے۔ جب تانگا تھانے کے سامنے پہنچا تو جمعہ خان نے بڑی بے تکلفی سے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''خادم حسین! تمہارے گھر کی طرف تو بعد میں جائیں گے، میں ذرا تھانے سے ہو لوں۔ اہلکاروں کو ضروری ہدایات دینا ہیں۔ آج انچارج صاحب بھی تھانے میں موجود نہیں ہیں، وہ کل رات سے ٹوبہ ٹیک سنگھ گئے ہوئے ہیں۔ ان کی غیر موجودگی میں یہاں کے سارے معاملات مجھے ہی دیکھنا پڑ رہے ہیں۔''

''تو کیا ہم ادھر تانگے ہی میں بیٹھیں؟'' میں نے جمعہ خان سے پوچھا۔

''تانگا کہیں بھاگا نہیں جا رہا، یار! جو تم اسے پکڑ کر بیٹھے رہو گے؟'' جمعہ خان نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ بھی تھانے میں ہی آ جاؤ۔ بس دس پندرہ منٹ کا کام ہے، پھر چلتے ہیں۔''

میں، حاجی اور جمعہ خان پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے تھانے کے اندر پہنچ گئے۔ حوالدار نے ہتھکڑی اُٹھائی اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''خادم حسین! آؤ تمہیں دکھاؤں، کسی شخص کو کیسے گرفتار کیا جاتا ہے۔''

''ہاں یار! میری بڑی خواہش ہے، یہ منظر دیکھنے کی۔'' میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔ ''لیکن تم کس کو گرفتار کرنا چاہتے ہو؟''

''اس وقت کمرے میں ہم صرف تین افراد ہیں۔'' حوالدار گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''تھانے کا دیگر عملہ اپنے کاموں میں مصروف ہے۔ میں گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔ تم



لوگ آپس میں فیصلہ کر لو کہ کس نے گرفتاری دینا ہے؟''

حاجی کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اس تغیر میں غصے کی سرخی نمایاں تھی۔ اس منظر نے مجھے بڑا لطف دیا۔ میں نے خوفزدگی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

''یار! مذاق نہ کرو..... میں نے کوئی جرم نہیں کیا، گرفتاری کیوں دوں؟''

''اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر.....؟'' اس نے ڈرامائی توقف کر کے حاجی کی طرف دیکھا۔

حاجی بپھر کر بولا۔ ''حوالدار! یہ کیا بکواس ہے؟''

''حاجی صاحب! یہ کوئی بکواس نہیں۔'' جمعہ خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں تو انچارج صاحب کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں۔''

''انچارج صاحب.....؟'' حاجی نے چونک کر حوالدار کی طرف دیکھا۔ ''مگر تم نے تھوڑی دیر پہلے تو بتایا تھا، تھانہ انچارج ٹوبہ ٹیک سنگھ گئے ہوئے ہیں۔''

''ہاں..... میں نے یہی کہا تھا۔'' جمعہ خان نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ مگر میں ان کو واپس آنے سے تو نہیں روک سکتا نا..... وہ آ گئے ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں؟''

تھانے دار، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے واپس آ گیا ہے؟'' حاجی اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''مگر وہ کہاں ہے؟''

''یہ.....'' جمعہ خان نے میری سمت انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ کھڑے ہیں، ملک صفدر حیات، تھانہ انچارج نور کوٹ.....!''

''مگر یہ تو خادم حسین.....؟''

حاجی کے منہ سے اتنا ہی نکلا تھا کہ میں نے ایک زناٹے دار طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا، پھر تحکمانہ انداز میں حوالدار سے کہا۔

''جمعہ خان!..... اس پاجی کو گرفتار کر لو۔''

جب تک حاجی اس تیزی سے بدلتی ہوئی صورتِ حال کو سمجھ پاتا، حوالدار نے کمال پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں آہنی زیور پہنا دیا، پھر میری ہدایت پر بے دریغ دھکے دیتے ہوئے اسے حوالات کے اندر پہنچا دیا۔

حاجی برکت علی رحمت علی کی حالت دیدنی تھی۔ جب اسے حوالات کے فرش پر پھینک کر دروازے کو لاک اپ کر دیا گیا تو وہ مجھے بڑی بڑی دھمکیاں دینے لگا۔ مجھے خطرناک نتائج سے ڈرانے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن میں نے اس کی پھوں پھاں کی ذرا پروا نہیں کی اور نہایت ہی کڑوے لہجے میں کہا۔

''حاجی صاحب! صرف ایک دن کی بات ہے، پھر سکندر شاہ، صوفیہ، صمد ہارون، چیمہ صاحب اور نئی زندگی میٹرنٹی ہوم کا سارا عملہ کسی نہ کسی تھانے کی حوالات میں تمہاری طرح پڑا دکھائی دے گا۔''

''کک..... کیا مطلب.....؟'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔

میرے خوف ناک انکشافات نے اس کے چہرے کی سانولی رنگت میں بڑی فراخ دلی سے سیاہی بھر دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں دہشت اور وحشت کے سائے ہم آغوش ہو کر بڑے بھیانک اور سنسنی خیز مناظر تخلیق کرنے لگے تھے۔

میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تھوڑا صبر، حاجی!..... میری کہی ہوئی ہر بات کا مطلب اور مفہوم بہت جلد تمہاری سمجھ دانی میں قیام پذیر ہو جائے گا۔''

وہ ایسی نظر سے مجھے دیکھنے لگا، جیسے میں انسانی روپ میں موت ہوں۔

❁.....❁

پچھلی رات ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ لگانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ ناشتے کے بعد میں خاصی کسل مندی محسوس کرنے لگا تھا اور دوپہر کے کھانے، نے تو مجھے بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا، خاص طور پر اس لئے بھی کہ یہ کھانا حاجی گڑبڑ کی کامیاب گرفتاری کے بعد کھایا تھا۔ بڑی شدت سے یہ دل چاہ رہا تھا کہ کہیں بھی پڑ کر میں ایسا بے خبر سوؤں کہ پھر اگلے ہی دن کی خبر لاؤں۔

لیکن ایس پی صاحب کا حکم تھا کہ آج کا دن مجھے ہر صورت جاگ کر گزارنا ہے۔ ان کی طرف سے کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے۔ لہٰذا میں خود پر جبر کر کے مسلسل جاگ رہا تھا۔ شام سے تھوڑی دیر پہلے ایک ایسی اطلاع مجھ تک پہنچی کہ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ پلک جھپکتے میں میری نیند کافور ہو گئی۔



کانسٹیبل عبدالغفور نے میرے کمرے میں آ کر بتایا۔

''ملک صاحب! ایس پی صاحب آئے ہیں۔''

''کیا.....؟'' میں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں تو گوندل صاحب کی طرف سے بلاوے کا منتظر تھا اور وہ خود ہی میرے پاس چلے آئے تھے۔ میں نے تصدیقی لہجے میں کانسٹیبل سے پوچھا۔

''غور سے کیا تم نے انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا محض نیلی گاڑی دیکھ کر.....'' میرا خیال یہی تھا کہ گل داد نیلی فیاٹ میں آیا ہو گا۔

میں اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ اسی لمحے مجھے گوندل صاحب اپنی جانب بڑھتے ہوئے نظر آ گئے تھے۔ میں کھڑا تو تھا ہی..... آگے بڑھ کر میں نے انہیں ایک زوردار سلیوٹ کیا اور اپنی کرسی ان کے لئے چھوڑ دی۔

انہوں نے میرے سلیوٹ کا جواب سر کی اثباتی جنبش سے دیا اور کہا۔

''صفدر حیات! تم اپنی کرسی میرے لئے نہیں چھوڑو۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ تمہاری کرسی کسی سینئر سب انسپکٹر یا انسپکٹر کے حصے میں آئے۔ کیونکہ تمہیں تو اس کرسی سے اُٹھنے کے بعد کسی ڈی ایس پی کی کرسی پر بیٹھنا چاہئے۔''

''سر.....!'' میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ ''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ.....''

''بیٹھ جاؤ، صفدر حیات!'' انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور میری میز کی دوسری طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئے۔

مجبوراً مجھے بھی اپنی کرسی پر بیٹھنا پڑا۔ اس وقت کمرے میں ہم دونوں کے سوا اور کوئی بھی نہیں تھا۔ گوندل صاحب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''صفدر حیات! حاجی برکت علی رحمت علی کو فوری طور پر گرفتار کرنا ہو گا۔''

''سر! سمجھیں، یہ کام ہو گیا۔'' میں نے اپنے جوش کو دباتے ہوئے کہا۔

''صرف سمجھنے سے بات نہیں بنے گی، صفدر حیات!'' وہ گمبھیر لہجے میں بولے۔ ''اس کی عملی گرفتاری ضروری ہے۔ کل صبح لاہور سے پولیس کی ایک گاڑی گرفتار شدہ حاجی کو لینے کے لئے پہنچے گی۔ تمہیں یہ کام ابھی اور اسی وقت کرنا ہے۔''

میں زیرِلب مسکرایا اور فخریہ لہجے میں کہا۔

''سر! میں نے آپ سے غلط نہیں کہا۔ حاجی برکت علی رحمت علی کو آپ پولیس کسٹڈی میں سمجھیں۔''

''کیا مطلب؟'' ان کی حیرت دوچند ہوگئی۔

میں نے آواز دے کر حوالدار کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس نے وہاں پہنچ کر پہلے ایس پی صاحب کو اور پھر مجھے سلیوٹ کیا۔ میں نے اس سے کہا۔

''جمعہ خان! اس حوالاتی کو ایس پی صاحب کے پاس لے آؤ، جسے ہم آج دوپہر کو بخت نگر سے اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔''

''اوکے سر!'' حوالدار تیزی سے مڑا اور ہماری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

''ویل ڈن، صفدر حیات.....!'' گوندل صاحب نے توصیفی لہجے میں کہا۔ ''میں اگر تمہاری ترقی کے لئے کوشاں ہوں تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ تم اس کا استحقاق رکھتے ہو۔''

''سر! میں گزشتہ رات ادھر لاہور میں جو حالات دیکھ کر آیا ہوں ان کا تقاضا یہی تھا کہ حاجی کو فوراً حراست میں لے لیا جائے۔ اگر یہ اِدھر اُدھر سلپ ہو جاتا تو میں آپ کو کیا منہ دکھاتا؟ آئی ایم ویری سوری سر! کہ میں نے آپ سے پوچھے بغیر.....''

''کسی سوری کی ضرورت نہیں ہے، صفدر حیات!'' وہ دوستانہ لہجے میں بولے۔ ''تم نے حاجی کو قابو کر کے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اِدھر لاہور میں اس کے گروہ کے تمام افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو، واقعی اگر یہ کم بخت کہیں سلپ ہو جاتا تو ہمارے لئے بڑی مصیبت ہو جاتی۔''

اسی لمحے جمعہ خان زیرِ حراست حاجی کو لے کر آ گیا۔ گوندل صاحب نے تنقیدی انداز میں سرتاپا اس کا جائزہ لیا اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''جمعہ خان! اسے وہیں ڈال دو، جہاں سے اُٹھا لائے ہو۔ کل تک یہ تمہارا مہمان ہے، لیکن تم اس کی ''خاطر داری'' میں نہیں لگ جانا۔ بس، اس کی نگرانی اور حفاظت کرنے کی ضرورت ہے۔ لاہور پولیس نے اس کی ''دعوت'' کے لئے ایک شاندار ''ضیافت'' کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے دیگر ساتھی وہاں پہنچ چکے ہیں، بس مہمانِ خصوصی



یعنی ''حاجی صاحب'' کا انتظار ہو رہا ہے۔''

میرا اشارہ پا کر جمعہ خان، حاجی کو اپنے ساتھ لے گیا تو میں نے ایس پی صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''گوندل صاحب! لاہور کی صورتِ حال کے بارے میں تو کچھ بتائیں۔''

وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''صفدر حیات! وہاں کی صورتِ حال بڑی گمبھیر اور افسوس ناک ہے۔''

''یعنی ہمارا شک بالکل درست نکلا۔'' میں نے سوالیہ نظروں سے ایس پی صاحب کو دیکھا۔ ''حاجی اینڈ کمپنی بردہ فروشی ایسے گھناؤنے کاروبار میں ملوث تھے؟''

''بردہ فروشی سے بھی کہیں زیادہ گھناؤنے اور قابلِ مذمت کاروبار میں۔'' وہ پُرسوچ لہجے میں بولے۔

''کیا مطلب سر؟'' میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

انہوں نے ایک افسردہ سانس خارج کی اور ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگے۔

''صفدر حیات! پچھلے تین مہینوں میں لاہور پولیس کو مختلف ویران علاقوں اور کچے کے ڈھیروں پر سے دس انسانی لاشیں پڑی ملی ہیں۔ ان لاشوں میں دو چیزیں مشترک پائی گئی ہیں۔ نمبر ایک، وہ دس کے دس جوان اور صحت مند افراد تھے۔ نمبر دو، بڑے بہیمانہ انداز میں انہیں ایک آپریشن سے گزارا گیا تھا اور اس آپریشن میں ان کے دونوں گردے نکال لئے گئے تھے۔''

''اوہ.....!'' میں نے بے ساختہ ایک متاسفانہ سانس خارج کی۔ ''تو..... اس کا مطلب ہے، وہ بردہ فروش نہیں، بلکہ گردہ فروش ہیں؟''

''بالکل..... یہی حقیقت ہے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

میں نے بے چینی سے ان کی طرف دیکھا اور متوحش لہجے میں استفسار کیا۔

''تو کیا بخت نگر سے جانے والے جوانوں.....؟''

''یہ بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں، صفدر حیات!'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اُٹھے۔ ''گزشتہ رات وہاں پہنچائے جانے والے چار جوان

اور پہلے سے وہاں موجود تین جوانوں کو زندہ سلامت پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا ہے۔ اگر تمہاری رپورٹنگ میں دو چار گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی تو یہ ساتوں کے ساتوں دیہاتی گبرو اپنے گردوں سے محروم ہو کر موت کو گلے لگا چکے ہوتے۔''

وہ لمحے بھر کے لئے سانس ہموار کرنے کو متوقف ہوئے، پھر اضافہ کرتے ہوئے بتایا۔

''تمہاری اطلاع پر میں نے اپنے اعلیٰ افسران سے رابطہ کیا، پھر آناً فاناً لاہور پولیس کو اس سنگین مسئلے سے آگاہ کر دیا گیا۔ وہ تو پہلے ہی اس گردہ فروش کی تلاش میں مختلف ہسپتالوں کو چیک کر رہے تھے، جہاں صحت سے بھرپور جوانوں کو گردوں سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ میٹرنٹی ہوم وغیرہ کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا تھا، لہٰذا انہوں نے آنِ واحد میں ''نیو لائف میٹرنٹی ہوم'' اور ''چشمہ ہاؤس'' پر ہنگامی چھاپہ مارا۔ صوفیہ، سکندر شاہ کے علاوہ ڈاکٹر صمد ہارون کو فوراً گرفتار کر لیا گیا۔ ''نیو لائف میٹرنٹی ہوم'' صمد ہارون کی ملکیت تھا۔ اس نے زچہ و بچہ کے معاملات کے لئے لیڈی ڈاکٹر اور نرسیں وغیرہ رکھی ہوئی تھیں اور اسی کوٹھی کے تہ خانے میں اس نے ایک خفیہ آپریشن تھیٹر بنا رکھا تھا، جہاں وہ بیرونِ ملک جانے کے ''شوقین'' افراد کے گردوں کو نکال لیا کرتا تھا۔ بخت نگر سے جانے والے سات جوانوں کو آج دوپہر کے بعد آپریشن سے گزارا جانے والا تھا۔ لیکن اس سے پہلے ہی لاہور پولیس نے مستعدی دکھا کر ان کے مذموم منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔ جو پولیس کی گاڑی حاجی برکت علی رحمت علی کو لینے آ رہی ہے، اسی میں وہ سات جوان بھی یہاں پہنچا دیئے جائیں گے۔''

''اگر یہ لوگ گردہ فروشی کے گھناؤنے دھندے میں ملوث تھے تو اس کا مطلب ہے، کچھ اور افراد بھی ہوں گے، جو ان سے فریش گردے خرید کر آگے کہیں پہنچاتے ہوں گے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے صفدر حیات!'' وہ تائیدی انداز میں بولے۔ ''گرفتار شدگان کو کڑی تفتیش سے گزارا جا رہا ہے۔ سننے میں آ رہا ہے کہ گردوں کے اس کاروبار کے ڈانڈے ملک سے باہر تک پھیلے ہوئے ہیں۔''

''گویا حاجی اینڈ کمپنی انسانی گردوں کی ریکروٹنگ کر رہے تھے؟'' میں نے



زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہ جوانوں کو نہیں، بلکہ ان کے تروتازہ گردوں کو بیرونِ ملک بھجواتے تھے؟''

''صفدر حیات! لاہور پولیس کا اعلیٰ سطح کا اجلاس بیٹھا ہوا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولے۔ ''وہاں تمہاری ذات بھی ڈسکس ہو رہی ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری کاوش ہی سے ممکن ہو سکا ہے۔ مجھے قوی امید ہے، جھنگ پولیس کو تمہارے حوالے سے خصوصی ہدایات جاری کی جانے والی ہیں۔ سمجھو کہ تمہاری ترقی ہونے میں اب زیادہ دیر باقی نہیں۔''

میں نے ممنونیت آمیز لہجے میں کہا۔

''سر! اگر اوپر کہیں میری تعریف ہو رہی ہے تو یہ سب آپ کے توسط سے ہے۔ میں نے تو اپنا فرض پورا کیا ہے..... اس سلسلے میں آپ نے بڑا مستعد اور ذمہ دارانہ کردار انجام دیا ہے۔''

''صفدر حیات! دنیا کا کوئی بھی محکمہ ہو، ٹانگ کھینچنے اور کام لگانے والے تو بہت مل جائیں گے، لیکن سچے، ہمدرد اور خیر خواہ خال خال ہی نظر آئیں گے۔'' انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ تمہاری گزشتہ رات کی دھوپ دوڑ اور کڑی محنت کو مناسب انداز میں آگے پہنچایا ہے۔ میری جگہ اگر کوئی اور سینئر افسر ہوتا تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کریڈٹ تمہارے حصے میں آتا۔ تم کافی عرصے سے میرے نیچے کام کر رہے ہو اور پچھلے کئی سالوں کی کارکردگی میرے سامنے ہے۔ میری دلی خواہش ہے کہ آنے والے وقت میں بہت جلد تمہیں ڈی ایس پی کے عہدے پر ترقی مل جائے۔''

''تھینک یو سر!'' میں نے تہِ دل سے گوندل صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

انہوں نے حاجی کے سلسلے میں مجھے چند ضروری ہدایات دیں اور صبح دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اس گردہ فروش کے بارے میں سوچنے لگا۔

بردہ فروش، گردہ فروش، عصمت فروش اور منشیات فروش تو مختلف شکلیں ہیں انسان کی..... ایک منفی انسان کی۔ میری نظر میں ایسے شخص کو بنیادی طور پر ضمیر فروش

کہنا چاہئے۔ جب کسی انسان کا ضمیر مردہ ہو جائے تو پھر وہ غلط صحیح کی شناخت بھول جاتا ہے۔ اس کی نگاہ صرف اور صرف اپنے مفاد پر لگی رہتی ہے اور اس مفاد کے حصول کے لئے وہ ''کچھ بھی فروش'' ہو سکتا ہے۔ ضمیر فروش انسان تو اپنے فائدے کے لئے دین اور مذہب و ملت بھی فروخت کرنے پر تیار ہو جاتا ہے، یہ دل، جگر اور گردے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔

آئندہ روز، دوپہر سے تھوڑی دیر پہلے بخت نگر کے ساتوں جوانوں اور حاجی برکت علی رحمت علی کا پُر امن ''تبادلہ'' ہو گیا۔

حاجی اینڈ کمپنی کو مرحلہ وار کیسی کڑی تفتیش سے گزارا گیا، مزید کن کن شرفاء کو شامل تفتیش کر کے ''خاطر مدارات'' کی گئی اور ان کی زبانوں سے کیا سنسنی خیز انکشافات ہوئے، یہ ایک الگ داستان ہے، جس کی تفصیل کہانی کی شکل میں پھر کبھی بیان کروں گا۔

بخت نگر زندہ سلامت، اپنے گردوں سمیت واپس لوٹنے والے ساتوں نوجوانوں کی حالت دیدنی تھی۔ وہ سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے نہیں تھکتے تھے۔ اشرف اور عارف نے تو باقاعدہ ناک سے لکیریں نکال کر اس بات کا عہد کیا کہ وہ زندگی میں کبھی اپنے وطن کو چھوڑ کر کہیں جانے کے بارے میں نہیں سوچیں گے اور اپنے پسینے کا ایک ایک قطرہ کھیت، کھلیان میں محنت مشقت کرتے ہوئے بہائیں گے۔ اس طرح ان کی زندگی اور صحت بھی سلامت رہے گی اور وطن کی زمین کی زرخیزی میں بھی اضافہ ہو گا۔

میرے خیال میں، اس سے زیادہ دانش مندانہ فیصلہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ جو لوگ اپنی اصلیت سے چپکے رہتے ہیں، کامیابی اور خوشحالی ان کے قدم چومتی ہے۔

❁.....❁



# گناہِ کبیرہ

گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے بچے کے باپ کے ساتھ اس کا چاچا بھی آیا تھا۔

دونوں بھائیوں میں گہری مماثلت پائی جاتی تھی۔ میں نے انہیں اپنے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جی بتائیں، آپ کا کیا معاملہ ہے؟''

''میرا بیٹا گم ہو گیا ہے، تھانے دار صاحب!'' بڑے بھائی نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ''ہم اسی کے بارے میں رپورٹ لکھوانے آئے ہیں۔''

میں اپنی کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جی..... میرا نام اللہ بخش ہے۔'' میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بتایا پھر اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ میرا چھوٹا بھائی نبی بخش ہے اور..... میرا جو بچہ گم ہوا ہے، اس کا نام قادر بخش ہے۔''

بہت سارے ''بخش'' ایک ہی جگہ جمع ہو گئے تھے۔

میں نے بہ غور دونوں بھائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے استفسار کیا۔

''کیا آپ لوگ اسی قصبے کے رہنے والے ہو؟''

''جی، تھانے دار صاحب!'' اللہ بخش اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ہم تین پیڑھیوں سے ادھر ہی رتن گڑھ میں رہ رہے ہیں۔''

مجھے قصبہ رتن گڑھ میں تعینات ہوئے لگ بھگ دو ماہ ہوئے تھے۔ رتن گڑھ خاصا گنجان اور بڑا قصبہ تھا۔ ڈھائی سے تین سو تک گھر وہاں آباد تھے۔ ظاہر ہے، وہاں کم از کم ایک ہزار افراد تو بستے ہی ہوں گے۔ میں ایک ایک کے چہرے سے واقف نہیں ہو سکتا تھا۔ پچھلے دو ماہ میں، میں نے تھانے کے معاملات اور مسائل کو تو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اب وہاں کے لوگوں کو سمجھنے اور سمجھانے کا وقت تھا۔ میں نے گم شدہ بچے کے باپ اللہ بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہارے بچے کی عمر کتنی ہے؟''

''دس سال۔'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''یہ میرا بڑا لڑکا ہے، قادر۔ اس سے چھوٹی بچی خالدہ ہے، جس کی عمر لگ بھگ آٹھ سال ہو گی۔''

میں نے خالدہ کو نظر انداز کرتے ہوئے گم شدہ قادر بخش عرف قادرا پر توجہ مرکوز کر دی اور پوچھا۔

''قادرا کب سے گم ہے؟''

''کل رات سے جناب!'' اس مرتبہ بچے کے چاچا نبی بخش نے جواب دیا۔

میں نے قادرا کے باپ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''اللہ بخش! تم نے اپنے بیٹے کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ابھی تک کیا کوششیں کی ہیں؟''

''بس جی..... ابھی تک تو گاؤں ہی میں ڈھونڈا ہے۔'' وہ مایوسی بھرے لہجے میں بولا۔ ''اس کے یار دوستوں سے پوچھا ہے، لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ اس قصبے میں تو کہیں نظر نہیں آیا۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہر طرف سے ناکام اور نامراد ہو کر تو آپ کے پاس آئے ہیں۔''

''وہ قصبے میں کہیں نظر نہیں آیا۔'' میں نے اللہ بخش کے ایک جملے کو پُرسوچ انداز میں دہرایا اور کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ موضع رتن گڑھ میں موجود ہی نہیں..... اگر قادرا رتن گڑھ میں نہیں اور کہیں باہر چلا گیا ہے تو پھر یہ اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا وہ اپنی مرضی سے کہیں گیا ہے یا اسے زبردستی لے جایا گیا ہے۔'' میں نے معنی خیز انداز



میں ذرا توقف کیا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''رتن گڑھ سے باہر، تمہارے قریبی رشتے دار کہاں کہاں رہتے ہیں؟''

نبی بخش نے جواب دیا۔

''جناب! ہم کُل تین بھائی بہن ہیں۔ دو بھائی تو ہم اس وقت آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ہماری اکلوتی بہن جو ہم دونوں سے بڑی بھی ہے، اس کا نام سلمیٰ ہے اور وہ شادی شدہ ہے جو کہ جمال پور میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کے علاوہ.....'' وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اس کے علاوہ قادرا کا نانکا (ننھیال) ہے۔ اس کا ماما کریم بخش، تاج نگر میں رہتا ہے اور نانی وغیرہ کا گھر کرم آباد میں ہے۔ بس کُل یہی ہماری برادری ہے..... میری سسرال تو اُدھر رتن گڑھ ہی میں ہے جناب!''

''ہوں.....!'' میں گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد نامی یہ گاؤں موضع رتن گڑھ کے گرد و نواح میں واقع تھے۔ جمال پور آٹھ میل مغرب میں، تاج نگر تین میل مشرق میں اور کرم آباد پانچ میل شمال میں۔ مجھے سوچ میں ڈوبا دیکھ کر قادرا کے باپ نے پوچھا۔

''تھانے دار صاحب! کہیں آپ ایسا تو نہیں سوچ رہے کہ قادرا اپنے کسی رشتے دار کے گھر چلا گیا ہو گا؟''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کیا اس رخ پر سوچنا مناسب نہیں ہے؟ کیا تمہارا بیٹا اپنے کسی رشتے دار کے گھر اس سے ملنے نہیں جا سکتا؟''

''جانے میں کوئی حرج یا قباحت تو نہیں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''لیکن پہلے ایسا کبھی ہوا نہیں۔ قادرا اکیلا کبھی گاؤں سے باہر نہیں گیا اور وہ بھی ہمیں بتائے بغیر۔''

''جو بات کبھی نہیں ہوئی ہوتی، وہ جب ہوتی ہے تو یہی کہا جاتا ہے کہ ایسا تو پہلی بار ہوا ہے۔'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ پھر اللہ بخش کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''آج پندرہ اگست ہے اور کل چودہ اگست کی تاریخ تھی، یعنی یومِ آزادی..... ذرا سوچ کر بتائیں، کل گھر میں کسی نے اسے ڈانٹا ڈپٹا تو نہیں؟..... یا کسی بات پر اس کی پٹائی ہوئی ہو؟ بچے عموماً اس قسم کی صورتِ حال میں بھی گھر چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔''

''ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جناب!'' نبی بخش نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔ ''وہ تو گھر میں سب کا بڑا لاڈلا تھا، سب اس سے محبت کرتے تھے۔ مارنا پیٹنا تو دُور کی بات ہے، اسے تو کبھی کسی نے غصے میں ڈانٹا بھی نہیں۔''

''تم کیا اپنے بڑے بھائی کے ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہو؟'' میں نے نبی بخش کو گھور کر دیکھا۔ ''جو تمہیں اندر کی اتنی باتیں معلوم ہیں؟''

''ہم دونوں بھائی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔'' نبی بخش نے جواب دیا۔ ''بس درمیان میں ہم نے ایک دیوار کھینچ رکھی ہے، تاکہ دو خاندانوں کی زندگی ایک جگہ بھی رہے اور الگ الگ بھی۔ ویسے اس دیوار کے باوجود بھی ہمارا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا ہے۔ لہٰذا اِدھر اُدھر کے حالات سے مکمل آگاہی حاصل ہوتی رہتی ہے۔''

''وہ کسی بات پر گھر سے ناراض ہو کر نہیں گیا۔ کسی نے اسے گھر سے نہیں نکالا ہے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہی ہے کہ اس کی گمشدگی میں کسی اور کا ہاتھ ہے..... کسی نے اسے غائب کیا ہے۔''

''ایسا کون ہو سکتا ہے جناب؟'' اللہ بخش نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''فی الحال تو میں اس شخص کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکتا۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن تفتیش کے بعد سب کچھ کھل کر سامنے آ جائے گا۔ اور اس کام کے لئے آپ لوگوں کو مجھ سے پورا تعاون کرنا ہوگا۔''

''ہم ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہیں۔'' اللہ بخش نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''میں تو چاہتا ہوں، جلد از جلد میرا بچہ مجھے مل جائے۔ بتائیں، میں آپ سے کیا تعاون کروں؟''

''سب سے پہلے تو تم یہ کرو کہ قادرا کی ایک تصویر لا کر مجھے دو۔'' میں نے کہا۔



''تاکہ اسے تلاش کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔''

''تصویر والی بات تو ممکن نہیں۔'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''ہم لوگوں نے کبھی کوئی فوٹو کھنچوائی ہی نہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ دونوں خود یا کسی اور کے تعاون سے ایک کام کرو۔ کسی طرح جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد جا کر یہ جاننے کی کوشش کرو کہ کہیں قادرا وہاں کسی گھر میں تو موجود نہیں۔ اگر وہ وہاں نہیں پایا جاتا تو پھر یہ بات حتمی شکل اختیار کر لے گی کہ اسے بہلا پھسلا کر یا زبردستی کسی نے غائب کیا ہے۔''

''یہ کام میں شام سے پہلے پہلے کر کے آپ کو رپورٹ دیتا ہوں، تھانیدار صاحب!'' قادرا کے چاچا نبی بخش نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''اس سلسلے میں بھائی اللہ بخش کو زحمت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اپنی مدد کے لئے دونوں سالوں کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ وہ دونوں ویسے بھی آج کل فارغ ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے اطمینان بھرے انداز میں کہا۔ ''نبی بخش! تم فوری طور پر اس نیک کام کے لئے روانہ ہو جاؤ اور رات تک واپس آ کر مجھے وہاں کی صورتِ حال کے بارے میں بتاؤ..... ابھی دن کا آغاز ہی ہوا ہے۔ تمہارے پاس کافی وقت ہے اس مشن کے لئے۔''

تھوڑی دیر کے بعد نبی بخش مجھ سے ضروری ہدایات لے کر رخصت ہو گیا تو میں نے قادرا کے باپ، اللہ بخش کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''اللہ بخش! تم نے بتایا ہے کہ قادرا کے بارے میں اس کے یاروں دوستوں سے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔ وہ لوگ کیا بتاتے ہیں؟''

''اللہ آپ کا بھلا کرے، جناب!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''تین لڑکے عیدو، کامی اور سرفراز سے میں نے بات کی تھی۔ یہ تینوں قادرا کے گہرے دوست ہیں اور ایک ساتھ مل کر کھیلتے رہتے ہیں۔ ان میں عیدو اور سرفراز تو قادرا کے ہم عمر ہی ہیں، لیکن کامی بارہ، تیرہ سال کا ہے۔ وہ باقی دونوں کے مقابلے میں کافی سمجھ دار ہے۔ ان تینوں کے مطابق، قادرا مغرب تک ان کے ساتھ تھا لیکن جب اندھیرا ہونے لگا تو

قادرا انہیں گھر آنے کا کہہ کر چلا آیا۔ اس کے بعد قادرا کو انہوں نے نہیں دیکھا لیکن..... کامی نے ایک عجیب بات کی تھی۔'' وہ کامی کے ذکر پر متذبذب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

اللہ بخش نے کچھ ایسے انداز میں بات کو ادھورا چھوڑا تھا کہ میرے کان کھڑے ہو گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا، جیسے وہ کامی کے حوالے سے کوئی اہم بات بتانے جا رہا تھا۔ میں نے حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''ہاں، ہاں..... بتاؤ اللہ بخش! کامی نے ایسی کون سی عجیب بات کر دی؟ تمہیں وہ عجیب لگی، لیکن ہو سکتا ہے میں سمجھ جاؤں۔''

وہ چند لمحات کے لئے اس طرح خاموش ہو گیا، جیسے اپنے ذہن میں بکھرے ہوئے مختلف خیالات کو ایک نقطے پر اکٹھا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں منتظر نگاہ سے اسے دیکھتا چلا گیا۔ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگا۔

''تھانیدار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ میں نے کبھی قادرا کو کھیلنے کودنے پر پابندی عائد نہیں کی، لیکن اسے یہ نصیحت کر رکھی ہے کہ جیسے ہی مغرب کی اذان ہو، وہ گھر آ جائے۔ میرے والد صاحب مرحوم خدا بخش کہتے تھے کہ شام کے وقت شیطان کے چیلوں کو..... یعنی شیطونگڑوں کو کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے اور وہ گلی محلوں میں گھوم پھر کر سب سے زیادہ شرارت معصوم بچوں کے ساتھ کرتے ہیں، اس لئے جو بچے مغرب کے بعد باہر کھیلتے ہیں، وہ کسی نہ کسی پریشانی یا تکلیف میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ شیطونگڑے مختلف حیلوں بہانوں سے انہیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ خیر، یہ تو ایک دوسری بات تھی، میں اصل میں آپ کو کامران عرف کامی کے بارے میں بتا رہا تھا۔''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''کامی نے مجھے بتایا ہے کہ مغرب کی اذان کے ساتھ ہی قادرا نے گھر جانے کی بات کی تو باقی دوستوں نے حسب معمول اس کا مذاق اُڑایا۔ لیکن اسے جانے سے نہیں روکا کیونکہ وہ اس کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ بہرحال.....'' وہ ایک مرتبہ پھر متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔



''کامی کے مطابق، قادرا کے جانے کے کافی دیر بعد جب وہ اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا تو اس نے راستے میں قادرا کو دیکھا۔ وہ سکندر شاہ کے ساتھ کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ کامی کو اسے وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی اور اس نے قادرا سے پوچھا کہ وہ ابھی تک گھر کیوں نہیں گیا۔ قادرا نے جواب دیا کہ بس، جا رہا ہوں۔ کامی اس کا جواب سن کر آگے بڑھ گیا۔''

اللہ بخش نے ذرا دیر کو رک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔

''کامی کی بتائی ہوئی یہ بات مجھے عجیب سی لگی تھی۔ اب پتہ نہیں، آپ اس سے کیا مطلب نکالتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''کامی کی بات میں سے بڑا گہرا مطلب برآمد ہو سکتا ہے، لیکن اس کام کے لئے تھوڑی محنت کرنا ہو گی۔ اور وہ محنت میں نے شروع کر دی ہے۔ تم بتاؤ، یہ سکندر شاہ کون ہے؟ کیا وہ تمہارا کوئی رشتے دار ہے؟''

''نہیں جناب!'' اس نے سر کو منفی جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اس بندے سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں۔ سکندر شاہ، جھاڑو والی سرکار کا خاص آدمی ہے۔ اور ادھر آستانے پر ان کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔''

اللہ بخش انکشاف پر انکشاف کرتا جا رہا تھا۔ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''اور..... یہ جھاڑو والی سرکار کون ہے؟''

مجھے اتنا تو معلوم تھا، نہر کے کنارے کے ساتھ کسی ملنگ ٹائپ شخص نے اپنا آستانہ بنا رکھا تھا اور لوگ اس کے پاس دعا، مدد اور تعویذ دھاگے کے لئے جاتے ہیں اور میرے خیال میں، اللہ بخش کا اشارہ بھی اسی ملنگ کی جانب تھا۔ لیکن میں چونکہ اسی کی زبانی سب کچھ سننا چاہتا تھا، اس لئے انجان بن گیا۔ میرے استفسار کے جواب میں اللہ بخش نے تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا۔

''اس بزرگ کا اصل نام تو قلندر شاہ ہے، لیکن وہ جھاڑو والی سرکار اور بادام شاہ کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ کچھ لوگ انہیں سائیں جی اور سائیں صاحب بھی کہتے

ہیں۔ اس قصبے اور آلے دوالے کے پنڈ دیہات کے لوگ انہیں بہت مانتے ہیں۔ وہ بہت پہنچی ہوئی ہستی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ سکندر شاہ انہی سائیں جی کا خاص آدمی ہے اور ان کے ساتھ ڈیرے پر رہتا ہے۔''

میں نے موقع محل کی مناسبت سے، ایسے ہی کہہ دیا۔

''اللہ بخش! اگر سائیں جی اتنی ہی پہنچی ہوئی ہستی ہیں تو میں آج ہی ان کی قدم بوسی کے لئے آستانے پر جاؤں گا اور قادرا کی گمشدگی کے سلسلے میں ان سے بھی مدد کی درخواست کروں گا۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ سائیں جی کو جھاڑو والی سرکار اور بادام شاہ کیوں کہا جاتا ہے؟''

میں نے یہ ساری باتیں، اللہ بخش کے عقیدت مندانہ رویے کو دیکھتے ہوئے، خاص طور پر اسے خوش کرنے کے لئے کی تھیں۔ میرا یہ حربہ کافی حد تک کامیاب رہا۔ میری، سائیں کی ذات میں دلچسپی نے اسے خوش کر دیا تھا۔ وہ جوش بھرے لہجے میں بتانے لگا۔

''سائیں جی بعض بیماریوں کا علاج جھاڑو کی مدد سے کرتے ہیں۔ وہ بیمار مرد یا عورت کو جھاڑو سے جھاڑتے ہیں تو وہ بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔ اور جہاں تک باداموں کا تعلق ہے.....'' اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر ایک گہری سانس لی اور گہری سنجیدگی سے بتانے لگا۔

''سائیں جی، جادو ٹونے کا علاج باداموں کی مدد سے کرتے ہیں۔ کسی پر چاہے کتنا ہی گندا عمل کیوں نہ کیا گیا ہو، وہ اپنی روحانی طاقت سے اس عمل کا توڑ کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں دبائی گئی بندش اور تعویذ وغیرہ کو وہ اپنے کلام اور پڑھائی کے ذریعے باداموں کے اندر کھینچ لاتے ہیں۔ یہ سائیں جی کا ایک بہت بڑا کمال ہے۔''

''واقعی..... سچ کہہ رہے ہو، اللہ بخش؟'' میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا، پھر پوچھا۔ ''کیا تم نے قادرا کی گمشدگی کے سلسلے میں سائیں جی کو زحمت دی؟''

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''جب مجھے پتہ چلا کہ قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ کھڑے کامی نے دیکھا تھا تو



میں قادرا کی تلاش کے سلسلے میں ادھر آستانے پر بھی گیا تھا۔ پورے علاقے میں قادرا کہیں نہیں ملا تھا۔ میں نے سوچا، جا کر سکندر سے بات کرتا ہوں۔ شاید وہ..... یا جھاڑو والی سرکار کچھ بتا دیں۔''

''پھر تمہیں وہاں سے کیا پتہ چلا؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے پوچھا۔

''جناب! میں رات کو کافی دیر سے آستانے پر گیا تھا۔'' اللہ بخش وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''نبی بخش بھی میرے ساتھ تھا۔ سائیں جی اس وقت سو رہے تھے، اس لئے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ میں نے سکندر شاہ سے قادرا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بڑا تسلی بخش جواب دیا اور میں وہاں سے واپس آ گیا۔''

''اس نے تمہیں کس طرح تسلی دی تھی؟'' میں نے اللہ بخش سے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''جب میں نے سکندر شاہ سے قادرا کی بات کی تو اس نے بتایا کہ ہاں، وہ آج رات کو قادرا سے ملا تھا۔ ان کے درمیان کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ سکندر شاہ نے قادرا کو دیکھا تو نصیحت کی کہ چھوٹے بچے اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتے، لہٰذا وہ فوراً گھر چلا جائے۔ سکندر شاہ کے مطابق، قادرا کی سمجھ میں اس کی بات آ گئی اور گھر جانے کے لئے وہ اپنے راستے پر ہو لیا۔ سکندر شاہ وہیں ٹھہر کر قادرا کو گھر جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر آستانے کی طرف چلا گیا۔

''ہوں.....'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی، پھر اللہ بخش سے پوچھا۔

''کیا تم نے سکندر شاہ کو قادرا کی پُراسرار گمشدگی کے بارے میں بتا دیا تھا؟''

''جی تھانے دار صاحب!'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''سکندر کو قادرا کے بارے میں جان کر افسوس ہوا تھا اور اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں صبح آستانے پر آ جاؤں، پھر سائیں جی سے بات کریں گے۔''

''صبح تو تم میرے پاس آ گئے ہو، قادرا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہاں سے فارغ ہونے کے بعد آستانے پر جاؤ گے؟''

''جی ہاں، ارادہ تو یہی ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ کی اجازت ہو تو۔''

بات ادھوری چھوڑ کر وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی سوچ کی عکاسی کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔

''ضرور.....ضرور، اللہ بخش! تمہیں جھاڑو والی سرکار کے آستانے پر جانے کے لئے مجھ سے اجازت لینے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ میں تو خود بھی سائیں جی سے ملاقات کا ارادہ رکھتا ہوں۔ یہ اچھا ہے کہ تمہی پہلے چلے جاؤ۔ جب تک میں ادھر کا کام نمٹا لیتا ہوں۔'' میں لمحے بھر کے لئے متوقف ہوا، پھر چونکے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔

''اور ہاں.....آستانے سے واپسی پر تم مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔ ذرا پتہ تو چلے کہ قبلہ قلندر شاہ صاحب کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے۔''

''ٹھیک ہے جناب! میں آپ کو وہاں کی پوری رپورٹ دینے کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔'' اللہ بخش نے پُر وثوق لہجے میں کہا۔

اُسے رخصت کرنے سے پہلے میں نے پوچھ لیا۔ ''اللہ بخش! تم کرتے کیا ہو؟.....میرا مطلب ہے، تمہارا ذریعہ معاش کیا ہے؟''

''تھانیدار صاحب! ہم دونوں بھائیوں کا مشترکہ کاروبار ہے۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''اور قصبے کے مین بازار میں ہماری کپڑے کی دکان ہے۔ یہ دکان ہمارے والد صاحب مرحوم خدا بخش نے قائم کی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہم دونوں نے یہ کام سنبھال لیا۔ والد صاحب کی زندگی میں بھی، میں اور نبی بخش ان کی مدد کے لئے دکان میں کام کرتے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اللہ بخش! بازار میں یہ دکان کس نام سے ہے؟''

''اللہ مدد کلاتھ مرچنٹ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''دکان کا یہ نام والد صاحب مرحوم نے رکھا تھا، اس لئے ہم نے ان کی وفات کے بعد نام تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہماری دکان ماشاء اللہ! خوب چلتی ہے، لیکن.....'' وہ ذرا دیر کے لئے تھما، پھر غم زدہ لہجے میں بولا۔

''لیکن آج ہم نے دکان نہیں کھولی۔ قادرا والے معاملے نے دماغ گھما رکھا ہے۔ میرا بیٹا مجھے مل جائے تو کسی اور بات کے بارے میں سوچوں گا۔''



''تم فکر نہ کرو، اللہ بخش!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ان شاء اللہ! میں بہت جلد تمہارے بیٹے کو ڈھونڈ نکالوں گا۔ تم آستانے کا چکر لگا کر فوراً میرے پاس آ جاؤ۔''

اس نے میرا شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کر جانے لگا۔ میں نے پوچھ لیا۔

''تم نے قادرا کے دوست کامی کا ذکر کیا تھا، وہ کیسے ملے گا؟ میں اس سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

اللہ بخش نے جواب دیا۔

''کامران عرف کامی، حفیظ اللہ کا بیٹا ہے۔ حفیظ اللہ ایک چھوٹا زمیندار ہے۔ اس کا گھر گاؤں کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔ میں اس کے گھر کے قریب سے گزر کر ہی آستانے کی طرف جاؤں گا۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں کامی کو آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں۔''

''ہاں، ضرور۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تم یہ نیک کام کرتے ہوئے آستانے کی جانب نکل جانا۔''

وہ مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

سمت اور رخ کے اعتبار سے میرا تھانہ موضع رتن گڑھ سے باہر، شمالی جانب میں نیم پختہ سڑک کے کنارے واقع تھا اور نہر جنوبی طرف تھی، جو مشرق سے مغرب کی سمت بہتی تھی۔ مذکورہ نیم پختہ سڑک اس نہر کے اوپر سے گزرتی تھی اور اسی نہر کے کنارے، رتن گڑھ کی طرف سائیں قلندر شاہ کا آستانہ تھا۔

میں سچے پیروں فقیروں، اللہ کے نیک بندوں اور روحانی بزرگوں کی بہت عزت اور احترام کرتا ہوں اور ایسے ولی اللہ افراد کی شان میں معمولی سی گستاخی کو بھی گناہِ عظیم تصور کرتا ہوں۔ لیکن فراڈ عاملوں کاملوں اور ڈبا قسم کے سائیں باباؤں سے مجھے خدا واسطے کا بیر ہے۔ معزز قارئین نے اکثر کہانیوں میں ایسے نقلی افراد کا میرے ہاتھوں حشر خراب ہوتے دیکھا ہوگا۔ یہ گھٹیا اور کمینے لوگ دراصل ایک ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں، جو انسانوں کے معاشرے کے لئے انتہائی مہلک اور خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ دھوکے باز بابا جہاں معصوم اور سادہ لوح لوگوں کو بے وقوف بنا کر ان کی جان، عزت،

مال اور جذبات سے کھیلتے ہیں، وہیں پر ان کے سیاہ کرتوتوں اور غلیظ کارناموں سے ''مرشد'' کا تصور بھی متاثر ہوتا ہے۔ لوگ سچے اور کھرے لوگوں کو بھی شک کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ لہٰذا ایسے کرداروں کو بے نقاب کرتے رہنا چاہئے، تاکہ کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہوتی رہے..... اور یہ کام اس معاشرے کے ہر فرد پر، ایک فرض کی طرح عائد ہوتا ہے!

میں نہیں جانتا تھا کہ جھاڑو والی سرکار کوئی اصل بزرگ ہے یا وہ بھی پیشہ ور لٹیرا ہے۔ لہٰذا فوری طور پر میں اس کے بارے میں کوئی اظہارِ رائے نہیں کر سکتا تھا۔ جب تک اس سے روبرو ملاقات نہ ہو جاتی، کچھ کہنا قبل از وقت اور نامناسب تھا اور یہ مجھے اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا کہ بہت جلد جھاڑو والی سرکار سے سامنا ہونے والا ہے۔ ویسے ایک بات میں نے خاص طور پر محسوس کی تھی کہ قصبہ رتن گڑھ اور اِدھر اُدھر کے دیہاتوں کے رہنے والے اس سائیں بابا کو بہت مانتے تھے۔

❁.....❁

دوپہر سے پہلے میں نے ایک کانسٹیبل کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔

''محمد اقبال! تم نے مجھے بتایا تھا کہ اسی قصبے سے تمہارا تعلق ہے..... پھر تو تم یہاں کے لوگوں کو اچھی طرح جانتے ہو گے؟''

''جی ملک صاحب! ہم لوگ جدی پشتی یہیں کے رہنے والے ہیں۔'' کانسٹیبل نے جواب دیا۔ ''اور میں تقریباً سبھی لوگوں کو جانتا ہوں۔''

''سائیں قلندر شاہ عرف جھاڑو والی سرکار کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے رازدارانہ انداز میں سوال کیا۔

وہ ایک دم بے انتہا سنجیدہ نظر آنے لگا، پھر پوچھا۔

''ملک صاحب! میں سمجھا نہیں، آپ کس حوالے سے میرا خیال جاننا چاہتے ہیں؟''

میرے سوال کے جواب میں جب اس نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا تو میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔



''میرا مطلب یہ تھا کہ تمہارے خیال میں یہ سائیں جی کیسا آدمی ہے؟''

اس کی سنجیدگی اور گہری ہو گئی، سپاٹ آواز میں بولا۔

''ملک صاحب! میں دراصل ..... سے تعلق رکھتا ہوں۔'' اس نے ایک فرقے کا نام لیا تھا۔ ''ہم پیروں فقیروں اور مزاروں کو نہیں مانتے۔ یوں سمجھیں، جس طرح عام لوگ اس حوالے سے تعلق اور عمل رکھتے ہیں، ہم ویسے عمل اور تعلق کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک یہ سراسر شرک ہے، ہم ایسے اعمال کو گناہ تصور کرتے ہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بڑی اچھی طرح سمجھ رہا ہوں، اقبال!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں فرقوں اور نظریوں کے اختلاف میں اُلجھنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ تم سائیں بابا کو مانتے ہو یا نہیں، اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں۔ جھاڑو والی سرکار کے بارے میں پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ تم یہاں کے رہنے والے ہو، لہٰذا اس کی اصلیت کے حوالے سے تمہارا علم مصدقہ ہو گا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب!'' وہ رسانیت سے بولا۔ ''سچی بات تو یہ ہے کہ میرا کبھی قلندر شاہ سے واسطہ نہیں پڑا، اسی لئے میں دعوے سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس قسم کا شخص ہے، البتہ.....''

وہ لمحے بھر کے لئے رکا، ایک گہری سانس خارج کی اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''البتہ، یہاں کے رہنے والے اور آس پاس کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے اکثر لوگ اس سے گہری عقیدت رکھتے ہیں، حالانکہ اسے یہاں آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا، اس کے باوجود بھی اس نے اپنا خاصا وسیع حلقہ بنا لیا ہے..... پتہ نہیں، وہ اپنے پاس آنے والوں کو کیا گھول گھول کر پلاتا رہتا ہے۔''

کانسٹیبل محمد اقبال نے آخری جملہ اس انداز میں ادا کیا تھا کہ اگر اسے پتہ چل جاتا کہ سائیں بابا اپنی کس شکتی سے لوگوں کو گرویدہ بناتا ہے تو وہ اس سے ایسی شکتی چھیننے اور چھین کر ضائع کرنے میں ایک لمحے کی دیر نہ کرتا۔ اقبال کی ایک بات نے مجھے چونکا دیا تھا، لہٰذا اسی حوالے سے میں نے سوال کر ڈالا۔

''سائیں بابا کو اس علاقے میں آ کر آستانہ قائم کئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''یہی کوئی تین، ساڑھے تین سال۔'' محمد اقبال نے جواب دیا۔

''اچھا.....اس کا مطلب ہے، وہ اس علاقے میں زیادہ پرانا نہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتے ہو، وہ کہاں سے آیا ہے، میرا مطلب ہے کہ رتن گڑھ سے پہلے وہ کہاں پر آستانہ چلاتا تھا؟''

''ملک صاحب! سچ پوچھیں تو میرا وہی معاملہ ہے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''جس پنڈ نہیں جانا، اس کا راستہ پوچھنے کا کیا فائدہ.....آپ میری بات تو سمجھ ہی گئے ہوں گے۔''

''بڑی اچھی طرح سمجھ گیا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں سائیں بابا، اس کے آستانے اور دیگر معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں..... ہے نا یہی بات؟''

''جی..... بالکل یہی بات ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔

میں نے گفتگو کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''اس قصبے میں بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا رہتا ہے۔ نام اس کا کامران ہے، جو کامی مشہور ہے۔ اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''

اس کی پیشانی پر پُرسوچ لکیریں اُبھریں، پھر اس نے مجھ سے پوچھا۔

''اس کامی کے ماں باپ کا کیا نام ہے؟''

''ماں کا تو مجھے پتہ نہیں، البتہ اس کے باپ کا نام حفیظ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''جو قصبہ رتن گڑھ کا ایک چھوٹا زمیندار ہے.....''

''پہنچ گیا..... میں کامی تک پہنچ گیا۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے بول اٹھا، پھر پوچھا۔ ''ملک صاحب! اس بچے کامی کا کیا ذکر نکل آیا؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اقبال! تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ اللہ بخش کپڑا فروش کا بچہ قادرا کل رات سے غائب ہے۔ وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی اپنے چھوٹے بھائی نبی بخش کے ساتھ قادرا کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرانے آیا تھا۔''



میں سانس ہموار کرنے کے لئے متوقف ہوا تو وہ جلدی سے بولا۔

''ہاں، یہ بات میرے علم میں ہے۔''

''کامی، قادرا کا گہرا دوست ہے۔'' میں نے بدستور سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''آخری مرتبہ کامی ہی نے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ سکندر شاہ، جھاڑو والی سرکار کا مرید خاص بتایا جاتا ہے۔ میں اسی لئے سائیں بابا اور کامی کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''ہوں.....'' کانسٹیبل محمد اقبال نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور بولا۔ ''میں نے آپ کو آستانے کے حوالے سے اپنی لاتعلقی اور عدم دلچسپی کا تو بتا دیا ہے، البتہ اگر آپ کہیں تو میں پوچھ گچھ کے لئے کامی کو پکڑ کر تھانے لے آتا ہوں۔''

''میں یہی چاہتا ہوں اقبال!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''اور جہاں تک تمہاری عدم دلچسپی اور لاتعلقی کا معاملہ ہے تو یہ میری نظر میں ایک مفید کوالٹی ہے۔ میں سائیں بابا کے آستانے پر جا کر بھی تفتیش کرنا چاہتا ہوں اور اس مشن میں تم میرے ساتھ رہو گے۔ ٹھیک ہے؟''

''فرض کی راہ میں، میں آپ کا ہر حکم بجا لانے کو تیار ہوں، ملک صاحب!'' وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''میں جا کر کامی کو لاتا ہوں۔''

میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے تعریفی نظر سے محمد اقبال کو دیکھا اور کہا۔

''شاباش اقبال! تمہارے مضبوط عزم اور بلند حوصلے کو دیکھتے ہوئے میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم ترقی کی راہ میں بہت آگے تک جاؤ گے۔''

''بہت بہت شکریہ ملک صاحب!'' وہ جذباتی ہو گیا۔

میں نے کامی کو لانے کے لئے اسے تھانے سے روانہ کر دیا۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ کامی اور اس کے باپ حفیظ اللہ کو لے کر واپس آ گیا۔ حفیظ اللہ یہ سن کر فکرمند ہو گیا تھا کہ اس کے بیٹے کو تھانے میں بلایا گیا ہے۔ اسی لئے وہ ساتھ آ گیا تھا۔ کانسٹیبل انہیں میرے کمرے میں چھوڑ کر باہر چلا گیا۔

حفیظ اللہ کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔ وہ متناسب جسم کا مالک ایک قدآور شخص تھا اور اس نے درمیانی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ رنگ سانولا اور صحت قابل

رشک۔ ہاتھ پاؤں اور کندھوں سے جفاکشی جھلکتی تھی۔ اس کا بیٹا کامران عرف کامی دُبلا پتلا اور دراز قامت لڑکا تھا۔ اللہ بخش نے کامی کی عمر بارہ سال بتائی تھی، لیکن وہ اپنے قد بت اور چہرے کے تاثرات سے پندرہ سولہ کا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں سے ہوشیاری کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ اپنے انداز واطوار سے خاصا تیز وطرار نظر آتا تھا۔

میں نے انہیں اپنے سامنے بٹھایا تو حفیظ اللہ نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''تھانیدار صاحب! خیریت تو ہے۔ آپ نے میرے بیٹے کو کس سلسلے میں یہاں بلایا ہے؟ اس نے ایسی کون سی خطا کر دی ہے؟''

''اس سے کوئی خطا نہیں ہوئی، حفیظ اللہ!'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس لئے تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہیں پتہ ہوگا کہ اللہ بخش کا بیٹا گزشتہ رات سے گم ہوگیا ہے۔ آخری بار کامی نے اسے دیکھا تھا۔ میں تمہارے بیٹے سے اسی سلسلے میں تھوڑی پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ ایک دم مطمئن نظر آنے لگا۔ میں کامی کی طرف متوجہ ہوگیا۔

''بیٹا! مجھے پتہ چلا ہے کہ تم نے کل رات قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا۔ ذرا اس بارے میں مجھے بتاؤ؟''

کامی نے نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''تھانیدار جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا تھا۔''

''اور اس کے بعد ہی قادرا گم ہے۔'' میں نے کامی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو، وہ دونوں آپس میں کیا باتیں کر رہے تھے؟''

''نہیں جناب! مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہوگئے تھے۔'' کامی نے کہا۔ ''میں قادرا کو اس طرف دیکھ کر حیران ہوا تھا، کیونکہ اس کا گھر تو دوسری جانب ہے۔''

پھر وہ مجھے گھروں کی تفصیل بتانے لگا۔ حفیظ اللہ زمیندار کا گھر موضع رتن گڑھ کے جنوبی کنارے پر واقع تھا، جس کے آگے کھیت شروع ہو جاتے تھے اور کھیتوں کا یہ سلسلہ نہر کے کنارے تک دراز تھا۔ اسی کنارے کے ساتھ سائیں قلندر شاہ عرف جھاڑو والی سرکار کا آستانہ آباد تھا۔ گاؤں کے اختتام سے کھیتوں کے بیچم بیچ ایک پگڈنڈی نہر



کے کنارے تک جاتی تھی۔ لوگ آستانے تک پہنچنے کے لئے یہی راستہ استعمال کرتے تھے۔ جبکہ قادرا کا گھر گاؤں کے مغربی حصے میں واقع تھا، اسی لئے کامی، قادرا کو اپنے گھر کی سمت دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ میں نے کامی کو کریدنے کے لئے پوچھا۔

''کامی! قادرا تمہارا گہرا دوست تھا۔ تم لوگ روزانہ مل جل کر کھیلتے تھے۔ ظاہر ہے، اس کی گمشدگی سے تمہیں بھی دکھ ہوا ہوگا؟''

''جی ہاں..... اس کے گم ہونے نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔'' وہ غم زدہ لہجے میں بولا۔ ''آپ اپنے سپاہیوں کو بھیج کر قادرا کو تلاش کرائیں۔''

''میں خود بھی جلد از جلد قادرا کو ڈھونڈ نکالنا چاہتا ہوں۔'' میں نے اسے اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میرے سپاہی تھانے سے روانہ ہونے کے لئے بالکل تیار بیٹھے ہیں، بس تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

''میری مدد.....؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''میں بھلا آپ کی کس طرح مدد کر سکتا ہوں جناب؟''

''کل شام میں تم چاروں ایک ساتھ کھیل رہے تھے۔ تم، قادرا، عیدو اور سرفراز..... ذرا سوچو، ذہن پر زور دو اور مجھے بتاؤ کہ قادرا نے کوئی ایسی بات کی تھی، جس سے ظاہر ہوتا ہو، اس کے گھر میں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے؟ کسی نے اسے مارا پیٹا ہے..... یا ایسی ہی کوئی اور بات؟''

اس نے ایک لمحہ سوچا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''نہیں تھانیدار جی! ایسی تو کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ اگر اس کے گھر میں کوئی مسئلہ ہوا ہوتا تو اس کا منہ لٹکا ہوا نظر آتا۔ کل پاکستان کی آزادی کا دن تھا۔ ہم سب دوستوں نے خوب کھیلا کودا اور مزے اُڑائے۔ ہماری طرح قادرا بھی بڑا پُرجوش اور خوش خوش تھا۔''

یہ بات، تو اللہ بخش بھی مجھے بتا چکا تھا کہ گھر میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ لیکن میں فرائض کی ادائیگی اور اپنی تسلی کے لئے کامی کے منہ سے اس امر کی تصدیق ضروری سمجھتا تھا اور کامی کے جواب نے میری تشفی کر دی تھی۔ میں دوبارہ اس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''ٹھیک ہے کامی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قادرا بھی کل تم لوگوں کی طرح خوش باش تھا۔ یہ بتاؤ کہ بات چیت کے دوران اس نے کوئی ایسا ارادہ ظاہر کیا کہ وہ کہیں جانے والا ہے؟''

''نہیں جناب!.....ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔''

''پھر شام ہوتے ہی وہ آپ لوگوں کو چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا تھا.....ہے نا؟''

''جی ہاں!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''اور آپ تینوں بعد میں بھی کھیلتے رہے تھے؟''

''جی.....ہم اور تھوڑی دیر تک کھیلتے رہے تھے۔'' کامی نے جواب دیا۔ ''پھر جب اندھیرا پھیلنے لگا تو ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف چل پڑے۔ عیدو اور سرفراز کا گھر تو اسی میدان کے قریب ہے جہاں ہم چاروں کھیل رہے تھے۔ قادرا کا گھر میدان اور میرے گھر کے درمیان واقع ہے اور میرا گھر گاؤں کے آخری کنارے پر کھیتوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔

''اور جب تم اپنے گھر جا رہے تھے تو تم نے راستے میں قادرا اور سکندر شاہ کو کھڑے باتیں کرتے دیکھا۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

''جی ہاں..... بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اور مجھے قادرا کو سکندر شاہ کے ساتھ اندھیرے میں کھڑے دیکھ کر حیرت اس لئے ہوئے تھی کہ اسے ہمیشہ شام میں گھر جانے کی جلدی لگی رہتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کا ابا رات کو دیر تک گھر سے باہر رہنے کے حق میں نہیں۔ وہ شام ہوتے ہی گھر آنے پر زور دیتا ہے۔''

''اللہ بخش ٹھیک کہتا ہے، تھانیدار صاحب!'' کامی کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی حفیظ اللہ بول اٹھا۔ ''میں بھی کامی کو ہمیشہ یہی نصیحت کرتا ہوں۔ لیکن میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔''

باپ کی بات پر کامی نے برا سا منہ بنایا، لیکن کچھ بولنے کے بجائے میری طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔



''کامی! کل رات جب تم نے قادرا اور سکندر شاہ کے ساتھ کھڑے دیکھا تھا تو تم دونوں میں کوئی بات چیت بھی ہوئی تھی یا تم انہیں باتیں کرتے دیکھ کر خاموشی سے آگے بڑھ گئے تھے؟''

اللہ بخش مجھے اس حوالے سے معلومات فراہم کر چکا تھا، جس کے مطابق، جب اس نے رات گئے سکندر شاہ کو آستانے پر جا کر قادرا کی گمشدگی کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا تھا..... میں نے قادرا کو دیکھ کر نصیحت کر دی کہ چھوٹے بچے اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتے لہٰذا تم فوراً گھر چلے جاؤ اور وہ گھر چلا گیا۔ بعد میں سکندر شاہ جھاڑو والی سرکار کے آستانے پر آ گیا تھا۔۔ اب میں کامی کے جواب سے بہ آسانی سکندر شاہ کے بیان کو بھی چیک کر سکتا تھا۔

کامی نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

''جناب! یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ قادرا کو گھر جانے کی جلدی لگی رہتی تھی، اسی لئے میں اسے سکندر شاہ کے ساتھ اندھیرے میں کھڑے دیکھ کر اُلجھ گیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سے پوچھ لیا۔ ''تم تو کافی دیر پہلے ہمیں چھوڑ کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟''

''میں شاہ صاحب کی باتیں سن رہا ہوں۔'' قادرا نے جواب دیا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں قادرا سے کوئی اور سوال کرتا، سکندر شاہ نے کہا۔ ''بیٹا! میں قادرا کو سمجھا رہا ہوں، یہ میری بات سننے کے بعد گھر چلا جائے گا۔ تم اپنے گھر جاؤ۔''

''میں سکندر شاہ سے بحث تو نہیں کر سکتا تھا، اس لئے چپ چاپ اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن آگے جاتے ہوئے میں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مڑ کر ان دونوں کو بھی دیکھ لیتا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے ان کی شکلیں تو صاف نظر نہیں آ رہی تھیں، البتہ یہ محسوس ہو رہا تھا کہ دو آدمی کھڑے باتیں کر رہے ہیں.....اور پھر میں اپنے گھر چلا گیا!

کامی خاموش ہوا تو میرے ذہن میں کھلبلی مچ چکی تھی۔ اس نے اپنے سادہ سے بیان میں بڑا سنسنی خیز انکشاف کر دیا تھا۔ اگر کامی نے کسی غلط بیانی سے کام نہیں لیا تھا تو پھر سکندر شاہ کی ذات شکوک و شبہات میں لپٹی ہوئی نظر آتی تھی.....اور کامی کے

چہرے کے تاثرات اور میرا پیشہ ورانہ تجربہ یہ کہتا تھا کہ کامی نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تھا۔

سکندر شاہ نے اللہ بخش کے استفسار پر اسے بتایا تھا کہ اس کی نصیحت سن کر قادرا اپنے گھر کی طرف چل پڑا تھا۔ سکندر شاہ تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر اسے گھر جاتے ہوئے دیکھتا رہا، پھر آستانے کی طرف چلا گیا تھا۔ جب کہ کامی کا بیان سکندر شاہ کے بیان کی نفی کرتا تھا۔ کامی کے مطابق، قادرا سکندر شاہ کے ساتھ باتوں میں مشغول رہا اور وہ اپنے گھر چلا گیا۔

اس پُراسرار صورتِ حال کو واضح کرنے کے لئے سکندر شاہ کا بھرپور انٹرویو ضروری ہو گیا تھا تاکہ حقیقت کا سراغ لگایا جا سکے۔ میں نے مزید دس منٹ تک کامی سے گھما پھرا کر مختلف سوالات کئے لیکن کام کی اور کوئی بات سامنے نہ آ سکی۔ لہٰذا میں نے اس تاکید کے ساتھ ان باپ بیٹے کو تھانے سے رخصت کر دیا۔

''حفیظ اللہ! تم اپنے بیٹے کو لے کر میرے پاس آئے اور تمہارے بیٹے نے مجھ سے بھرپور تعاون کیا۔ اس کے لئے میں تم دونوں کا بہت شکر گزار ہوں۔ آئندہ کے لئے بھی اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھنا اور جیسے ہی قادرا کے حوالے سے کوئی سن گن ملے، فوراً آ کر مجھے بتانا۔''

انہوں نے میری ہدایات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا اور اپنے گھر چلے گئے۔ اللہ بخش مجھ سے ملنے کے بعد سائیں قلندر شاہ کے آستانے کی طرف گیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ واپسی پر وہ پہلے مجھے رپورٹ دے گا، پھر اپنے گھر کا رخ کرے گا۔ میں اس کی پیش کردہ رپورٹ کی روشنی میں آگے حرکت کرنا چاہتا تھا کہ کم سے کم وقت خرچ کر کے جلد از جلد گمشدہ بچے کو بازیاب کیا جا سکے۔

حفیظ اللہ اینڈ سن کے جانے کے بعد میں نے کانسٹیبل محمد اقبال کو اپنے پاس بلا لیا۔ وہ حاضر ہوا تو میں نے اس سے کہا۔

''ضروری تیاری کر لو، اقبال! دوپہر کے کھانے کے بعد ہم دونوں آستانے کی طرف چلیں گے۔ جس مشن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا، اس کے آغاز کا وقت آ گیا ہے۔''



وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا۔ ''ملک صاحب! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن.....''

''لیکن کیا اقبال؟'' میں نے گھور کر اسے دیکھا۔

وہ بولا۔

''تھانے میں مجھ سے سینئر کئی افراد موجود ہیں۔ اے ایس آئی فیض احمد، حوالدار مبارک علی اور.....''

''اور کیا؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اقبال! کھل کر کہو جو بھی کہنا چاہتے ہو.....تم مجھے اپنا افسر نہیں بلکہ ایک دوست سمجھو۔''

میرے حوصلہ دلانے پر وہ مطمئن انداز میں بولا۔

''ملک صاحب! آپ کے رویے سے لگتا ہی نہیں کہ آپ تھانہ انچارج ہیں۔ آج تک مجھے کسی انچارج صاحب کے ساتھ کسی مشن میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا، اس لئے شاید ایسا محسوس ہو رہا ہے۔''

''یہی تو میں بھی پوچھ رہا ہوں، تم کیا محسوس کر رہے ہو؟''

کانسٹیبل محمد اقبال نے جواب دیا۔

''مجھ سے سینئر افراد کو یہ اعتراض نہیں ہوگا کہ ان کو نظر انداز کر کے آپ مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں؟''

''اس تھانے کا انچارج کون ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ظاہر ہے.....آپ ہی ہیں ملک صاحب!'' وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔

''اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر کون جا رہا ہے؟''

''آپ۔'' وہ اور زیادہ اُلجھ گیا۔

''جب میں تھانیدار ہوں یہاں کا.....'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور تم میری مرضی سے کسی مشن میں حصہ لے رہے ہو تو پھر تھانے کے عملے میں سے کسی کو اعتراض کی جرأت کیسے ہو سکتی ہے؟'' میں لمحے بھر کو سانس لینے کی غرض سے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اپنے ذہن کو بالکل صاف اور پُرسکون رکھ کر وہی کام کرو، جس کا میں نے تمہیں حکم دیا ہے۔ باقی سب کچھ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اللہ بخش مجھے وہاں کی رپورٹ دے دے، پھر ہم ادھر آستانے کی طرف روانہ ہوں گے.....ٹھیک ہے؟"

"جو آپ کا حکم جناب!" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں جا کر روانگی کی تیاری کرتا ہوں۔"

"شاباش!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

❁.....❁

اللہ بخش کی واپسی دوپہر کے بعد ہوئی۔ اس وقت تک میں کھانا کھا چکا تھا۔ میں نے فوراً اسے اپنے کمرے میں بلا لیا۔ وہ ابھی ٹھیک طرح بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ میں نے سوال داغ دیا۔

"اللہ بخش! کیا جھاڑو والی سرکار سے تمہاری ملاقات ہوگئی؟"

"جی تھانیدار صاحب!" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "میں ابھی وہیں سے آ رہا ہوں۔ سائیں جی کسی گہرے مراقبے میں تھے، اس لئے دیر ہوگئی۔"

"چلو، کوئی بات نہیں۔ ایسے معاملے میں دیر سویر ہو ہی جاتی ہے۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "یہ بتاؤ، تم نے سائیں قلندر شاہ کو اپنی پریشانی سے آگاہ کر دیا؟.....اور انہوں نے تمہاری بپتا سننے کے بعد کیا فرمایا ہے؟"

"انہوں نے پوری توجہ سے میری بات سنی اور کہا کہ بچے کی تلاش اور بازیابی کے لئے وہی طریقہ اپنانا پڑے گا جو اللہ کا وضع کردہ ہے۔ انہوں نے قادرا کی ماں کو بلایا ہے۔"

"قادرا کی ماں کو.....؟" میں نے چونک کر اللہ بخش کو دیکھا۔

"جی، تھانیدار صاحب!" وہ سادگی سے بولا۔

میں نے وضاحت طلب کرتے ہوئے کہا۔

"قادرا کی ماں کا اس کی تلاش سے کیا تعلق ہے؟ اور..... یہ اللہ کا وضع کردہ طریقہ کون سا ہے؟"

اللہ بخش نے سائیں کے حوالے سے جو بات کی تھی، اس نے میرے ذہن کو خاصا



اُلجھا دیا تھا۔ وہ میرے سوالات کے جواب میں بتانے لگا۔

"جناب! میری دکھ بھری کہانی سننے کے بعد سائیں جی مراقبے میں چلے گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں بند رکھتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا، اللہ بخش! کیا تمہیں پتہ ہے کہ عامل کامل کسی بندے کا حساب لگانے کے لئے اس کا نام مع والدہ کیوں مانگتے ہیں؟ میں نے اپنی کم علمی اور لاعلمی ظاہر کر دی۔ انہوں نے فرمایا۔

"ماں کا اپنی اولاد سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے، اسی لئے عامل کامل نام مع والدہ حساب لگاتے ہیں۔ وہ قدرتی طریقے کو اپناتے ہیں اور میں بھی تمہارے بیٹے کی تلاش کے لئے یہی طریقہ اختیار کرنا چاہتا ہوں۔"

اللہ بخش سانس درست کرنے کے لئے متوقف ہوا، پھر اپنی بات پوری کرتے ہوئے بولا۔

"میں جھاڑو والی سرکار کی بات سن کر خاموش ہوگیا اور پوری توجہ ان کی باتوں پر مرکوز کر دی۔ وہ اپنی آنکھوں کو بدستور بند رکھتے ہوئے گویا ہوئے۔

"اللہ بخش! تمہارے بچے کو ڈھونڈنے کے لئے مجھے تمہاری بیوی پر ایک خاص عمل کرنا ہوگا۔ اور اس عمل کے دوران وہ اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جائے گی۔ پھر اسی کیفیت میں اس کی زبان حرکت میں آ جائے گی اور اس زبان سے بچے کا سراغ ملے گا۔ تمہاری بیوی نیند کی حالت میں اس جگہ کی نشاندہی کرے گی، جہاں قادرا اس وقت موجود ہے۔ جب میں تمہیں اس جگہ کے بارے میں بتاؤں گا تو تم وہاں جا کر اپنے بچے کو لے آنا۔ تمہارے بیٹے قادرا کو بازیاب کرنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔"

اللہ بخش، سائیں قلندر شاہ کے ارشاداتِ خبیثہ اور فرموداتِ ذلیلہ بیان کر کے خاموش ہوا تو میں جھاڑو والی سرکار کی اصلیت تک پہنچ گیا۔ اسی لمحے میرے تصور میں ایک چوکور شے اُبھرنے ڈوبنے لگی اور سوچ میں ان الفاظ کی گونج پیدا ہوئی۔

"ڈبا پیر.....ڈبا پیر.....!"

کسی گم شدہ بچے کی تلاش کے سلسلے میں اس کی ماں پر کسی قسم کے عمل کی کوئی تک نہیں بنتی تھی۔ اس کا مطلب تھا، سائیں قلندر شاہ کی نیت صاف نہیں تھی۔ وہ بچے کی

تلاش کی آڑ میں بچے کی ماں پر ہاتھ صاف اور دانت تیز کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجھے اس قماش کے ہوس پرست باباؤں کا وسیع تجربہ تھا اور انہیں راہِ راست پر لانے کے ایک سو ایک گُر مجھے آتے تھے۔ تو..... موضع رتن گڑھ میں بھی کوئی ایسی ہی کہانی میری منتظر تھی..... اور مجھے ایک معاشرتی ناسور کو سرجری سے گزارنے کے لئے کوئی ایسا لائحہ عمل تیار کرنا تھا، جس کے نتیجے میں سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی سلامت رہے۔

سائیں کے چیلے سکندر شاہ کی ذات شک کے دائرے میں آ چکی تھی اور اب یہ جھاڑو والی سرکار بھی گردن گردن تک قعرِ مذلت میں ڈوبا ہوا نظر آ رہا تھا، لہٰذا مجھے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا تھا، تاکہ کسی ناکامی کا امکان باقی نہ رہے۔

یہ بات میں نے بڑی اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ اللہ بخش اپنے دل میں سائیں بابا کے لئے گہری عقیدت رکھتا تھا، اس لئے فی الحال ضروری یہی تھا کہ میں کھل کر اس کے سامنے سائیں کے خلاف کوئی بات نہ کروں۔ میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔

''اللہ بخش! سائیں جی نے تمہاری بیوی کو کب اپنے پاس بلایا ہے؟''

''آج رات کو جناب!'' اس نے جواب دیا۔ ''سائیں بابا نے کہا ہے کہ میں زاہدہ کو سورج غروب ہونے کے فوراً بعد ان کے آستانے پر پہنچا دوں۔ وہ اندھیرا پھیلتے ہی اس پر کوئی روحانی عمل کریں گے، جس کے بعد وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ آدھے گھنٹے..... یا پھر ایک گھنٹے کے بعد وہ بے ہوشی ہی کی حالت میں قادرا کے بارے میں بتائے گی۔''

میں یہ سوچے بِنا نہ رہ سکا کہ اللہ بخش کی بیوی زاہدہ بڑی خوب صورت عورت ہو گی۔ سائیں قلندر شاہ جیسی سرکاروں کے طریقۂ واردات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ لوگ اپنی ہوس کی تکمیل کے لئے نت نئے فارمولے آزماتے ہیں، جنہیں یہ مختلف قسم کے روحانی عمل کا نام دیتے ہیں۔ یہ روحانیت نہیں بلکہ روحانیت کو بدنام کرنے کی ایک گھناؤنی سازش ہے۔ ایسے سازشی افراد کے خلاف معاشرے کے ہر فرد کو انفرادی اور اجتماعی طور پر مل جل کر جہاد کرنا چاہئے۔ معاشرتی مسائل کے خلاف جہاد کرنا اس جہاد سے سو درجے افضل ہے،، جو معاشرے کی حدود سے باہر نکل کر کیا



جاتا ہے۔ اور اس کارِ خیر میں ان لوگوں کو بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہئے کو اصل اور سچی روحانیت کے علم بردار اور روح رواں ہیں۔ کیونکہ سائیں قلندر شاہ جیسے ناگی باباؤں کی یہ مکروہ حرکتیں دراصل انہی ہستیوں کی نیک نامی پر ایک کھلا حملہ ہیں!

میں نے اللہ بخش سے پوچھا۔

''کیا تمہیں بھی رات کو اپنی بیوی کے ساتھ، سائیں جی کے آستانے پر جانے کی اجازت ہو گی یا زاہدہ کو انہوں نے اکیلے ہی بلایا ہے؟''

''انہوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو ایک ساتھ بلایا ہے، تھانیدار صاحب!'' اللہ بخش نے جواب دیا۔ ''میں ہال میں بیٹھ کر انتظار کروں گا اور سائیں جی، زاہدہ کو اپنے مخصوص حجرے میں لے جا کر اس پر عمل کریں گے۔ پھر جب زاہدہ کی زبان سے قادرا کا اتا پتہ معلوم ہو جائے گا تو سائیں جی اسے حجرے سے باہر لے آئیں گے اور مجھے بتائیں گے کہ میں کہاں جا کر اپنے گم شدہ بچے کو تلاش کروں..... اس کے بعد ہم دونوں میاں بیوی واپس گھر آ جائیں گے۔ یہ ہے ساری تفصیل، تھانیدار صاحب!''

''ہوں.....!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''تو سائیں جی نے تمہیں رات والے عمل کے بارے میں اچھی طرح سمجھا دیا ہے؟''

''جی..... جی ہاں۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔

میرے ذہن میں مسلسل ایک پراجیکٹ پر کام ہو رہا تھا۔ جب سے مجھے جھاڑو والی سرکار کی اصلیت کا علم ہوا تھا، میں اس سے نمٹنے کے لئے ہی سوچ رہا تھا جس کے نتیجے میں خود بہ خود ایک لائحہ عمل ترتیب پاتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن میں اللہ بخش کو اپنی پلاننگ سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ قلندر شاہ کا معتقد تھا۔ اگر میں سائیں کے خلاف کوئی بات کرتا تو وہ اس کے ذہن کے لئے قابلِ قبول نہ ہوتی۔ میں اس سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ بیوی کو ایک نقلی عامل کے حجرے میں نہ پہنچانا، ورنہ ڈیش، ڈیش، ڈیش۔ اللہ بخش کے ساتھ اسی کی فریکوئنسی میں بات کرنے کی ضرورت تھی۔۔ چنانچہ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اللہ بخش! انسان کو اپنے مسائل حل کرنے کے لئے دنیاوی اور روحانی دونوں راستے اختیار کرنا چاہئیں۔ اس میں کوئی برائی یا خرابی والی بات نہیں ہے۔ تم نے قادرا

کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرادی ہے، میں نے اس کی تلاش کے لئے عملی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں۔ تم رات کو ضرور زاہدہ کے ساتھ سائیں جی کے آستانے پر جاؤ۔ اگر سائیں جی اپنے کسی عمل سے قادرا کے محلِ وقوع کا سراغ لگالیں تو میرے لئے بڑی آسانیاں ہو جائیں گی۔ میں تمہارے بیٹے کو جلدی ڈھونڈ نکالوں گا۔''

میں لمحے بھر کو سانس لینے کے لئے رکا، پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہیں دو ضروری کام کرنا ہوں گے، اللہ بخش!''

''جی حکم تھانیدار صاحب!'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا چھوٹا بھائی نبی بخش اپنے سالوں کے ساتھ، قادرا کی تلاش میں جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد کی طرف گیا ہوا ہے۔ وہ جیسے ہی واپس آئے، تم اسے فوراً میرے پاس بھیج دینا، ٹھیک ہے؟''

''بالکل ٹھیک جناب!'' وہ فرماں برداری سے بولا، پھر پوچھا۔ ''اور دوسرا کام؟''

''دوسرا کام یہ ہے اللہ بخش.....!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''جب تم اپنی بیوی زاہدہ کے ساتھ، شام کو آستانے کی طرف جانے لگو تو مجھ سے ملتے ہوئے جانا۔''

اس نے اُلجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔

''کوئی خاص بات ہے جناب؟''

''ہاں.....'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''مجھے سائیں جی کے لئے ایک تحفہ بھجوانا ہے۔ خود بھی کسی وقت ملاقات کے لئے آستانے پر جاؤں گا۔ جب تک خود جانے کا موقع نہیں ملتا، کچھ نذر نذرانہ تو بھیج ہی دوں۔''

''بالکل، بالکل جناب!'' وہ جلدی سے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ سائیں جی بہت پہنچی ہوئی ہستی ہیں۔''

میں نے تائیدی انداز میں اپنے سر کو حرکت دی اور دل ہی دل میں کہا، اللہ بخش! تمہیں کیا معلوم کہ جھاڑو والی سرکار کہاں تک پہنچی ہوئی ہستی ہے۔ اور وہ چال باز آج رات کو تمہاری بیوی کو جس ''بلند مقام'' پر پہنچانے کا ارادہ رکھتا ہے، اس کا تو تم تصور



بھی نہیں کر سکتے..... لیکن ظاہر ہے، اس غریب اور سادہ دل انسان کو سائیں کی مکاری کا علم نہیں تھا، اس لئے وہ مطمئن اور پُراعتماد نظر آتا تھا اور میرے ذہن میں رات کی کارروائی کے لئے جو منصوبہ ترتیب پا چکا تھا، اس کا تقاضا یہی تھا کہ میں فی الحال اللہ بخش کو اس کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ مجھے خاموش اور سوچ میں ڈوبا دیکھ کر اللہ بخش نے کہا۔

''تھانیدار صاحب! آپ بھی ہمارے ساتھ ہی آستانے پر چلیں نا۔''

''یہ ممکن نہیں، اللہ بخش!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک تو تھانے میں بہت زیادہ کام ہے اور دوسرے آج ایس پی صاحب کی آمد بھی متوقع ہے۔ اس علاقے کے ایس پی صاحب سے میری گہری دوستی ہے۔ وہ آج کسی وقت بھی مجھ سے ملنے یہاں تھانے آسکتے ہیں، لہٰذا میرا یہاں موجود رہنا بہت ضروری ہے۔''

میری اس فوری تیار کردہ وضاحت کے آگے وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا اور مجھے سلام کر کے تھانے سے رخصت ہو گیا۔

اللہ بخش کے جانے کے بعد میں قادرا کی گمشدگی اور سائیں جھاڑو والی سرکار کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی تھی کہ زاہدہ کو اپنے آستانے پر بلا کر اور حجرے میں بند کر کے کوئی عمل کرنے کا راگ دینا سراسر سائیں کے مذموم ارادے کی تکمیل کا اعلان تھا۔ وہ قادرا کی آڑ میں اس کی ماں سے فیض اُٹھانا چاہتا تھا۔ سائیں قلندر شاہ جیسے نقلی اور فراڈ پیروں کو صرف دو چیزوں کی ہوس ہوتی ہے۔ نمبر ایک دولت، نمبر دو عورت! اس کے علاوہ آستانے کے دیگر معاملات فروعی ہوتے ہیں، جو خود بہ خود چلتے رہتے ہیں۔

اب یہاں پر ایک اہم سوال پیدا ہوتا تھا.....!

سائیں قلندر شاہ اپنی ہوس کی تکمیل کے بعد اللہ بخش کو، قادرا کے بارے میں کیا بتائے گا؟ (ویسے میرے پروگرام میں یہ شامل تھا کہ میں آستانے والی کارروائی میں اللہ بخش کی بیوی زاہدہ کی عزت پر کوئی حرف نہیں آنے دوں گا) اسے کچھ نہ کچھ تو بتانا ہی تھا۔ یا تو قادرا کا مکمل سراغ یا پھر کوئی ٹامک ٹوئی! زیادہ امکان ٹامک ٹوئی ہی کا تھا۔

اور.....اگر وہ قادرا کی وقوعہ پذیری کا ٹھیک ٹھیک پتہ دیتا ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ قادرا کی گمشدگی میں اسی کا غالب ہاتھ ہے۔ کیونکہ نہ تو وہ روحانی عامل تھا اور نہ ہی ایسی کوئی خبر دے سکتا تھا۔

آستانے ہی کے تعلق سے سکندر شاہ کی ذات بھی شک کی چادر میں لپٹی نظر آتی تھی۔ سکندر شاہ، قلندر شاہ کا خاص آدمی تھا اور گم شدہ قادرا کو اسی سکندر شاہ کے ساتھ آخری مرتبہ مشکوک انداز میں باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

رات کو اللہ بخش کی روانگی کے بعد تو مجھے ایک خفیہ آپریشن کے لئے آستانے کی طرف جانا ہی تھا، لیکن اس سے پہلے بھی وہاں کا ایک چکر ضروری تھا، تاکہ میں اس آستانے کو اور اس کے محلِ وقوع کو اچھی طرح اپنی آنکھوں میں بسا سکوں اور رات والی کارروائی میں کوئی دقت پیش نہ آئے اور.....اس کے ساتھ ہی سکندر شاہ کا ہلکا پھلکا انٹرویو بھی ہو جاتا۔

میں نے ابھی تک سکندر شاہ اور قلندر شاہ کو نہیں دیکھا تھا۔ اور دونوں بھی مجھے شکل سے نہیں پہچانتے تھے۔ اس لئے اگر میں کانسٹیبل محمد اقبال کے ساتھ کسی کانسٹیبل کی حیثیت سے آستانے پر جا کر سکندر شاہ سے پوچھ گچھ کرتا تو اس میں زیادہ سسپنس ہوتا اور یہ ایک معمول کی کارروائی بھی نظر آتی۔

میں نے اپنے پروگرام کو حتمی شکل دی ہی تھی کہ محمد اقبال میرے کمرے میں آ گیا اور آتے ہی اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کیا پروگرام ہے، ملک صاحب؟''

''پروگرام تو وہی ہے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس کے لئے تمہیں چند اہم باتوں کو ذہن میں رکھنا ہوگا۔''

''جی.....حکم کریں؟'' وہ ہمہ تن گوش ہو گیا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے محمد اقبال کو اپنی پلاننگ سے آگاہ کر دیا۔ جب پوری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تو میں نے اس سے کہا۔

''تمہاری جسامت مجھ سے ملتی جلتی ہے۔ مجھے تمہاری ایک شرٹ چاہئے ہوگی، تاکہ میں مکمل کانسٹیبل نظر آؤں۔ پھر ہم خاموشی سے آستانے کی طرف روانہ ہو جائیں



گے۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

❁.....❁

ٹھیک چار بجے سہ پہر ''دو کانسٹیبل'' سائیں قلندر شاہ کے آستانے پر پہنچ گئے۔ ان میں ایک کا نام محمد اقبال اور دوسرے کا جاوید خان تھا۔ اور یہ جاوید خان کانسٹیبل کے روپ میں کوئی اور نہیں بلکہ میں خود یعنی ملک صفدر حیات تھانہ انچارج موضع رتن گڑھ تھا۔

نہر کے کنارے کے ساتھ وہ آستانہ اچھے خاصے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور اس آستانے کی پشت نہر کے کنارے کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ آستانے میں آمدورفت کا راستہ گاؤں کی جانب سے تھا۔ یعنی نہر کی مخالف سمت سے اور ہم اسی طرف سے وہاں پہنچے تھے۔

آستانے کے داخلی دروازے سے اندر آئیں تو ایک وسیع و عریض دالان نما صحن آتا تھا۔ جس میں چھوٹے بڑے مختلف رنگ و نسل کے درخت ایستادہ تھے۔ اس کشادہ صحن میں باورچی خانہ، اسٹور روم وغیرہ ایک دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ دوسری دیوار کے ساتھ بھی دو رہائشی کمرے نظر آ رہے تھے۔ صحن کے بعد، عمارت والے حصے میں ایک قدرے اونچی چھت والا ہال نما کمرا تھا، جہاں پیر سائیں اپنے عقیدت مندوں کے سامنے ''جلوہ افروز'' ہوتے تھے۔ اس ہال کے عقب میں جھاڑو والی سرکار کا حجرہ واقع تھا۔ اس حجرے میں آمدورفت کے لئے دو راستے تھے۔ ایک تو وہی ہال کی جانب سے اور دوسرا عقب میں نہر کی سمت۔ یہ عقبی راستہ عموماً بند ہی رہتا تھا اور پیر سائیں اپنی مرضی سے بہ وقت ضرورت اسے استعمال کرتے تھے۔

ہم صحن میں داخل ہوئے تو درمیانے قد کا ایک دیہاتی، رہائشی کمرے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گیا۔ وہ اپنے جثے اور ڈیل ڈول سے لڑائی بھڑائی کا ماہر کوئی غصہ ور شخص نظر آتا تھا۔ ہم پر نگاہ پڑتے ہی وہ ہماری طرف آ گیا۔

اس نے باری باری ہم دونوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ اقبال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں اطمینان جھلکا جبکہ میرے نظارے نے اسے تھوڑا اُلجھا دیا۔ اقبال نے

فوراً کہا۔

''نئی بھرتی ہے.....کانسٹیبل جاوید خان۔''

اس شخص نے سکون بھری سانس خارج کی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ اقبال کی صورت سے واقف تھا اور میرے ناشناسا چہرے نے اسے اُلجھا دیا تھا اور اس شخص کا یہ رویہ میرے لئے مفید ثابت ہوا تھا۔ ازاں بعد، مذکورہ شخص کا نام سخی محمد عرف سخیا معلوم ہوا۔ محمد اقبال کی وضاحت سے مطمئن ہونے کے بعد سخیا نے یکے بعد دیگرے سوالیہ نظروں سے ہم دونوں کو دیکھا۔

محمد اقبال نے کہا۔

''سخیا! ہم ایک ضروری کام سے آستانے پر آئے ہیں۔ ہمیں تھانیدار صاحب نے اِدھر بھیجا ہے۔''

سخیا نے ہمارے بیٹھنے کے لئے فوراً ایک چارپائی بچھا دی اور قدرے اکڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''سنتری بادشاہ! حکم کرو.....کیا کام ہے؟''

میں نے سخیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''کام دراصل، سائیں جی سے ہے۔ انچارج صاحب نے انہی کے پاس بھیجا ہے۔''

اس نے ایک لمحہ سوچا، پھر بچھی ہوئی چارپائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ بیٹھیں جی.....میں سائیں جی کو آپ کے بارے میں بتا کر آتا ہوں۔''

بات ختم کرتے ہی وہ آستانے کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

محمد اقبال نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹھیں ملک صاحب! دیکھتے ہیں، یہ سخیا کیا خبر لے کر آتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق سخیا، سائیں صاحب کی خدمت شدمت کے لئے ادھر آستانے پر ہی موجود ہوتا ہے۔ آستانے پر کل تین افراد ہوتے ہیں۔ سائیں قلندر شاہ، سکندر شاہ اور سخیا۔''

میں نے کانسٹیبل کی آواز پر توجہ مرکز رکھتے ہوئے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ سخیا آستانے کے اندرونی حصے میں غائب ہو چکا تھا اور اس وقت سکندر شاہ بھی کہیں نظر



نہیں آ رہا تھا۔ میرے اور اقبال کے سوا وہاں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبل سے کہا۔

''محمد اقبال! سوہنے محمد ﷺ تمہارا اقبال بلند کریں.....تم بیٹھو ادھر چارپائی پر۔ میں ذرا گھوم پھر کر آستانے کا جائزہ لیتا ہوں۔''

اسی ''گھومنے پھرنے'' کے دوران میں نے آستانے کا جو ''جائزہ'' لیا، اوپر اس وقوع پذیری کی تفصیل بیان کی ہے۔ میری یہ تحقیق رات والے مشن کے لئے نہایت ہی اہم تھی!

لگ بھگ دس منٹ کے بعد سخیا عمارت میں سے نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ ایک ہٹا کٹا شخص بھی تھا۔ اس وقت تک میں راؤنڈ لگا کر واپس آ چکا تھا۔ میں نے سخیا کے گینڈے ہم راہی کے بارے میں محمد اقبال سے استفسار کیا۔

''اقبال! کیا یہی جھاڑو والی سرکار، سائیں قلندر شاہ ہے؟''

''نہیں، ملک صاحب!'' وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ''یہ سائیں کا خاص بندہ سکندر شاہ ہے۔''

سکندر شاہ سے یہ میرا پہلا ''تعارف'' تھا۔ وہ اپنے حلیے اور وضع قطع سے ایک بنا بنایا ڈبا پیر نظر آتا تھا۔ چہرہ مکروہ، بے ترتیب داڑھی، ماتھے پر نحوست اور آنکھوں میں ناچتی ہوئی ہوس کی مخصوص سرخی اور دیکھنے کے انداز میں بڑا ندیدہ پن.....مغرور اور خود پسند!

سکندر شاہ، سخیا کی معیت میں ہمارے پاس پہنچا اور کراری آواز میں کہا۔

''السلام علیکم!''

اس کے بعد وہ تنقیدی نظروں سے باری باری ہم دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ ہم نے اس کے سلام کا جواب دیا اور محمد اقبال نے اس سے کہا۔

''ہم سائیں جی سے ملنے آئے ہیں۔''

عام طور پر میرے تجربے میں یہ آیا ہے کہ پولیس کا کوئی معمولی سا اہلکار بھی کہیں کسی کام سے جائے تو اسے چائے پانی کے لئے پوچھا جاتا ہے۔ لیکن سکندر شاہ نے ایسے کسی تکلف کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سخیا نے اسے جا

کر بتایا ہوگا، تھانے سے دو کانسٹیبلو آئے ہیں اور اس مغرور کی نظر میں کانسٹیبلز کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ اس قسم کی سوچ صرف اسی شخص کی ہوسکتی ہے، جو خود کو کوئی توپ قسم کی شے سمجھتا ہو..... یا پھر کسی توپ کا گولہ!

سکندر شاہ نے سخیا کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا اور محمد اقبال کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بات کے جواب میں بولا۔

''آپ کو سائیں جی سے کیا کام ہے؟''

میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

''کام بہت ضروری ہے جناب!..... صرف سائیں جی کو ہی بتایا جا سکتا ہے..... کیا وہ آستانے کے اندر موجود ہیں؟''

اس نے جواب دینے سے پہلے سر تا پا گھور کر مجھے دیکھا، جیسے میرا ایکس رے کر رہا ہو، پھر بھاری بھرکم آواز میں بولا۔

''سائیں صاحب اس وقت اپنے حجرے میں آرام فرما رہے ہیں۔ اگر خاص طور پر انہی سے ملنا ہے تو پھر آپ لوگ شام میں ادھر آئیں۔ میں ان کو بیدار کرنے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، پھر نخوت بھرے انداز میں اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ لوگ کام مجھے بتا دیں تو ہوسکتا ہے، آپ کو سائیں جی سے ملاقات کی ضرورت ہی پیش نہ آئے، میں آپ کا کام کر دوں..... مرشد اکثر کاموں کے سلسلے میں میری ہی خدمت لیتے ہیں۔''

میں نے سوچنے والے انداز میں محمد اقبال کی طرف دیکھا اور پھر گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اقبال! یہ شاہ صاحب ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں..... ہمیں اپنا مسئلہ ان کو بتا دینا چاہئے۔ یہ سائیں صاحب کے بہت قریب ہیں، ضرور ہماری مدد کریں گے۔''

ویسے بھی مجھے سائیں قلندر شاہ سے فی الحال ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس سے رات ہی کو ایک بھرپور ملاقات ہوتی۔ میں اس وقت دراصل سکندر شاہ کا انٹرویو کرنے آستانے پر آیا تھا اور وہ میرے سامنے موجود تھا۔



اقبال نے میری تجویز کے جواب میں کہا۔

''ٹھیک ہے جاوید خان! تم پوچھ لو ان سے، کیا پوچھنا ہے۔''

وہ جان بوجھ کر مجھے ''تم'' کے صیغے سے مخاطب کر رہا تھا، تاکہ سکندر شاہ کو کسی قسم کا شک نہ ہو۔ ویسے میرے لئے یہ بات بڑی اطمینان بخش تھی کہ سکندر شاہ مجھے تھانہ انچارج کی حیثیت سے پہچان نہیں سکا تھا۔ محمد اقبال کا اشارہ پاتے ہی میں شروع ہو گیا۔

میں نے سکندر شاہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! ہم دراصل، اللہ بخش کے گم شدہ بچے قادرا کی تلاش کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں اور.....''

''سائیں جی اور آستانے کا اس بچے کی گمشدگی سے کیا تعلق؟'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی تڑپ کر بولا۔

اس کے انداز نے مجھے سلگا کر رکھ دیا، لیکن میں برداشت کر گیا کیونکہ میں اس وقت تھانیدار کی حیثیت سے وہاں نہیں گیا تھا۔ اور دوسری جانب ایک سپاہی کے مقابلے میں سائیں کے بندۂ خاص کی اہمیت بھی کم نہیں تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو معتدل رکھتے ہوئے کہا۔

''شاہ جی! تعلق تو ہے..... اور آپ بھی اس بات کو مانیں گے۔''

''کیا تعلق ہے؟'' وہ بدستور اُکھڑے ہوئے انداز میں بولا۔ ''ذرا وضاحت کرو تم۔''

میں نے کہا۔

''یہ آستانہ سائیں قلندر شاہ کا ہے اور تم سائیں جی کے خاص آدمی ہو۔'' میں بھی فوراً آپ کے بجائے تم پر آ گیا تھا۔ ''جب گم شدہ قادرا کا تعلق تم سے ہوسکتا ہے تو پھر آستانے یا سائیں صاحب سے کیسے نہیں ہوسکتا؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''سکندر شاہ! ہمارے پاس اس بات کے مصدقہ ثبوت موجود ہیں کہ تم ہی وہ آدمی

ہو، جسے آخری مرتبہ قادرا کے ساتھ دیکھا گیا ہے..... یعنی قادرا اپنی گمشدگی سے پہلے تمہارے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے اور یہ واقعہ کچھ زیادہ پرانا نہیں، بلکہ کل ہی رات کا ہے۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' وہ غصیلے لہجے میں بولا۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ میری بات سن کر اس کا چہرہ متغیر ہو گیا تھا، جیسے میں نے اس کے کسی انتہائی نازک پہلو کو چھیڑ دیا ہو۔ اس کی حالتِ غیر سے میں محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا اور سکندر شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے کہا۔

''یہ بکواس نہیں، بلکہ اٹل حقیقت ہے۔ اور اس واقعے کی بڑی ٹھوس گواہی ہے پولیس کے پاس۔''

''ٹھوس گواہی؟'' اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ذرا مجھے بھی تو پتہ چلے کہ وہ گواہی کیا ہے؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''وہ ٹھوس گواہی دو افراد کی شہادت کے حوالے سے ہے اور دونوں افراد کے بیان میں تھوڑا تضاد بھی پایا جاتا ہے۔ اور یہ تضاد تمہاری وجہ سے ہے، اس لئے تم ہی اس امر کی وضاحت کرو گے۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ میرے غیر متزلزل انداز نے اسے گڑبڑا دیا تھا، آنکھیں سکیڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی اکڑ میں خاصی کمی آ گئی تھی۔

''وہ دو گواہ کون لوگ ہیں؟ اور انہوں نے میرے خلاف کیا شہادت دی ہے؟''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ان دو گواہوں میں سے ایک کا نام کامران عرف کامی ہے۔ یہ بارہ تیرہ سال کا ایک دُبلا پتلا اور دراز قامت لڑکا ہے، جو کل رات گمشدہ قادرا کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اگر تم کامی کو نہیں جانتے تو اس کے باپ حفیظ اللہ کو ضرور پہچانتے ہو گے۔ وہ موضع رتن گڑھ کا ایک چھوٹا زمیندار ہے۔''

میں سانس لینے کے لئے لمحہ بھر کو رکا، پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔



''کل رات کامی نہیں تمہیں قادرا کے ساتھ اس جگہ کھڑے باتیں کرتے دیکھا تھا، جہاں سے ایک سیدھی پگڈنڈی آستانے کی طرف آتی ہے۔ کامی کا گھر اِدھر ہی گاؤں کے کنارے پر واقع ہے۔ کامی نے قادرا کو تمہارے ساتھ کھڑے دیکھ کر حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا کہ تم ابھی تک گھر کیوں نہیں گئے؟ کیونکہ قادرا تھوڑی دیر پہلے گھر جانے کا کہہ کر اس کے پاس سے گیا تھا اور قادرا کا گھر بھی گاؤں کی دوسری سمت ہے۔ تم نے اس سے کہا.....''

''میں نے کسی کامی شامی سے کچھ نہیں کہا۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''یہ لڑکا سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔''

''تو کیا قادرا کا باپ، اللہ بخش بھی سراسر جھوٹ بول رہا ہے؟'' میں نے قدرے بگڑے ہوئے انداز میں استفسار کیا۔

''اللہ بخش.....!'' اس نے متذبذب انداز میں دہرایا۔ ''اللہ بخش کیا کہہ رہا ہے؟''

''میں نے جن دو گواہوں کا ابھی ذکر کیا ہے نا، ان میں ایک تو کامی اور دوسرا اللہ بخش ہے۔'' میں نے بدستور اس کے چہرے پر نگاہ جمائے ہوئے کہا۔ ''گزشتہ رات اللہ بخش، قادرا کی تلاش میں اِدھر آستانے پر بھی آیا تھا کیونکہ کامی نے اسے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ تمہاری اللہ بخش سے بات ہوئی اور تم نے اس امر کا اقرار کیا کہ قادرا سے تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ تم نے قادرا کو نصیحت کی تھی کہ چھوٹے بچے اتنی رات کو گھر سے باہر نہیں رہتے..... اور وہ تمہاری نصیحت سن کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ تم تھوڑی دیر تک وہیں کھڑے ہو کر اسے گھر جاتے دیکھتے رہے، پھر آستانے کی طرف چل پڑے تھے۔ جب کہ کامی نے ذرا مختلف بیان دیا ہے اور وہی یہ تضاد ہے جس کا میں نے شروع میں ذکر کیا تھا۔''

میں ایک مرتبہ پھر تھوڑا متوقف ہوا، ایک گہری سانس لے کر خود کو تر و تازہ کیا اور سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''کامی کا کہنا یہ ہے کہ نہ تو قادرا تمہاری نصیحت سن کر اپنے گھر کی جانب بڑھا تھا اور نہ ہی تم آستانے کی طرف بلکہ اس کا خیال ہے کہ تم نے اسے ایسی کوئی نصیحت ہی

نہیں کی تھی۔ کامی تم دونوں کو اندھیرے میں کھڑے باتیں کرتے چھوڑ کر اپنے گھر چلا گیا تھا۔ سکندر شاہ! کامی اور اللہ بخش میں سے کوئی ایک تو جھوٹا ہو سکتا ہے، مگر دونوں کو بہ یک وقت جھٹلانا ممکن نہیں اور..... دونوں کے بیانات میں بنیادی تضاد کے ساتھ ہی ایک قدر مشترک بھی موجود ہے اور وہ یہ کہ..... گزشتہ رات تم گم شدہ قادرا سے ملے تھے، جبکہ تم ابھی اس حقیقت سے انکار کر چکے ہو۔''

سکندر شاہ ان لمحات میں مجھے خاصا پھنسا ہوا نظر آیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا دیر نہ لگی کہ قادرا کی گمشدگی میں کسی نہ کسی حوالے سے اس کا ہاتھ ضرور رہا ہو گا، ورنہ وہ اس طرح نہ بدکتا۔ تاہم وہ فوری طور پر خود کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کامی اور اللہ بخش نے جھوٹ کیوں بولا؟ جبکہ میں قادرا سے بالکل نہیں ملا۔ میں تو اس کی شکل سے بھی واقف نہیں ہوں۔''

میں نے ایسے انداز سے جملہ ادھورا چھوڑا، جیسے آگے کہنے کے لئے اس کے پاس کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ میں اس کی بدلتی ہوئی کیفیت کو اچھی طرح سمجھ گیا اور سپاٹ آواز میں کہا۔

''چلو، کوئی بات نہیں۔ یہی بیان تم تھانہ انچارج کے سامنے دے دینا۔ اللہ اللہ، خیر سلا۔ ہو سکتا ہے، انچارج صاحب تمہاری بات کو سمجھ جائیں۔''

''میں خود بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' وہ گمبھیر لہجے میں بولا۔ ''میری بات کو سمجھنا تم سنتریوں کے بس کا کھیل نہیں۔ میں تمہارے انچارج صاحب ہی سے ملوں گا۔''

''ملوں گا نہیں..... ابھی چل کر ملیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہم تمہیں اپنے ساتھ لے کر جائیں گے۔''

وہ خاصا متفکر نظر آنے لگا۔ میرے اٹل انداز نے اسے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ رسی تڑوا کر بھاگ نکلنے والے کسی خود سر جانور کے مانند دوڑ لگا دے گا۔ آنِ واحد میں، میرے وجود میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا اور میں دل و جان سے اس بات کے لئے تیار ہو گیا کہ حلوے مانڈے کھا کر سانڈ کی صورت اختیار کرنے والے سکندر شاہ نے اگر اچانک فرار کی راہ اختیار کی تو میں اسے نکلنے کا ہرگز ہرگز موقع نہیں دوں گا۔



تاہم دو سو گز کی دوڑ میں حصہ لینے کے بجائے اس نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

''مجھے تمہارے تھانہ انچارج ہی سے بات کرنا پڑے گی، لیکن..... ایک منٹ ٹھہرو، میں ذرا سائیں جی کو بتا آؤں، پھر تمہارے ساتھ تھانے چلتا ہوں۔''

سکندر شاہ کی بدنیتی اس کی آنکھوں اور چہرے سے مترشح تھی۔ مجھے ایک سو ایک فیصد یقین ہو گیا کہ وہ سائیں کے پاس جانے کا بہانہ کر کے رفو چکر ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہے اور اس کا یہ فراری ارادہ اس بات کا غماز تھا کہ قادرا کی گمشدگی والے معاملے میں اس کے ہاتھ پاؤں خاصے آلودہ تھے، چاہے یہ آلودگی اس کی مرضی سے ملی تھی یا سائیں جی کے حکم پر اس نے کسی کچرا کنڈی سے گندگی کھانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ریڈ الرٹ ہوتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

''سکندر شاہ! قبلہ سائیں صاحب تو اس وقت آرام فرما رہے ہیں، انہیں ان چھوٹے چھوٹے کاموں کے لئے زحمت دینا ٹھیک نہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو، انچارج صاحب سے بات کرنا اور دس منٹ میں واپس آستانے پر آ جانا۔''

وہ گھرے ہوئے کتے کے مانند بوکھلا کر رہ گیا، اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔

''آپ لوگ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سائیں جی کو اس بارے میں بتانا بہت ضروری ہے۔''

''لیکن سائیں صاحب تو اس وقت اپنے حجرے میں آرام فرما رہے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جب ہم نے سائیں سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تھی تو تم نے انہیں بیدار کرنے کی گستاخی سے صاف انکار کر دیا تھا اور اب.....!''

''تم لوگ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے۔'' وہ میری بات کو کاٹتے ہوئے بولا۔ ''یہ روحانی معاملات ہیں..... سائیں جی کو بتانا بہت ضروری ہے۔''

میں نے ترش لہجے میں کہا۔

''سکندر شاہ! یہ بخیا بھی تو کافی عرصے سے آستانے پر سائیں جی کی خدمت کر رہا

ہے۔ سائیں نے اس کے اندر بھی اچھی خاصی روحانیت بھر دی ہو گی۔ تم ہمارے ساتھ چلو۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو سخیا، سائیں کو بتا دے گا۔ ویسے بھی....'' میں نے اپنے ہاتھ کو ہوا میں کسی جہاز کے مانند حرکت دی اور کہا۔ ''تم نے یوں جانا ہے اور یوں آنا ہے۔''

سائیں کے چیلے سکندر شاہ کو آہنی زیور پہنا کر تھانے لانا میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا، لیکن بہ حیثیت کانسٹیبل جاوید خان، اس سے یہ اٹھکیلیاں کرنے میں مجھے بڑا مزہ آ رہا تھا۔ لیکن جب میں نے دیکھا کہ میری اس تفریح میں وقت ضائع ہو رہا ہے تو میں ذرا سخت ہو گیا تھا۔ وہ میری تجویز کے جواب میں جھنجلا کر بولا۔

''تم سمجھتے نہیں ہو، سائیں جی سے میرا کیا معاملہ ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے، میں تمہاری بات رکھ لیتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم اپنے سائیں جی کو مطلع کرنے کے بعد ہمارے ساتھ تھانے چلنا۔ چلیں، اسی بہانے ہمیں بھی سائیں جی کا دیدار کرنے کا موقع نصیب ہو جائے گا اور ہم یہ بھی دیکھنے اور سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ اپنے مرشد قبلہ سائیں قلندر شاہ سے تمہارے کس قسم کے روحانی معاملات ہیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' وہ اس طرح اُچھلا جیسے بجلی کے ننگے تار سے چھو گیا ہو۔

''کیا میں تم دونوں کو اپنے ساتھ حجرے میں لے کر جاؤں گا؟''

میں نے اس کے دُکھتے ہوئے زخم پر بڑی میٹھی سی چوٹ لگائی۔ ''اگر.....ہم دونوں کا وہاں جانا مناسب نہیں تو پھر محمد اقبال ادھر ہی رک جاتا ہے اور صرف میں تمہارے ہمراہ سائیں جی کے پاس چلتا ہوں۔''

''ناممکن۔'' وہ قطعی انداز میں بولا۔ ''میں تم میں سے کسی کو بھی سائیں جی کے حجرے میں نہیں لے جا سکتا۔ آخر تخلیہ بھی کوئی شے ہے۔''

''اگر ہم حجرے میں نہیں جائیں گے تو تمہیں بھی نہیں جانے دیں گے۔'' میں نے خالص تھانیدارانہ لہجے میں کہا۔ ''قانون کی بالادستی، سائیں کے تخلیے سے زیادہ اہم ہے۔''

سخیا ہماری اس گرما گرمی کو دیکھتے ہوئے قریب آ گیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں



میں دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''ہم ضروری پوچھ گچھ کے لئے سکندر شاہ کو تھانے لے جا رہے ہیں۔ اس دوران میں تم سائیں جی کے آرام کا خاص خیال رکھنا۔ ویسے تو مجھے امید ہے، سکندر شاہ پندرہ بیس منٹ میں واپس آ جائے گا۔ اور اگر خدانخواستہ اس کی واپسی سے پہلے سائیں جی کی آنکھ کھل جائے تو انہیں بتا دینا، تھانیدار صاحب نے کوئی ضروری بات کرنے کے لئے سکندر شاہ کو تھانے بلایا ہے۔''

پھر سخیا کا جواب سنے اور ردِ عمل دیکھے بغیر ہم سکندر شاہ کو اپنے ساتھ لے کر تھانے آ گئے۔ راستے بھر تو وہ ہمیں سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ ہم یہ سب کچھ ٹھیک نہیں کر رہے۔ وہ تھانہ انچارج سے ہمارے روّیے کی شکایت کرے گا، جس کے نتیجے میں ہو سکتا ہے، انچارج صاحب ہماری پیٹیاں اُتروا دیں یا ہمیں لائن حاضر کر دیں، یا پھر کم از کم ہمیں اُلٹا لٹکا کر چھتر ماریں گے۔ لیکن جب تھانے پہنچ کر اسے پتہ چلا کہ میں ہی وہاں کا انچارج ہوں تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اور دماغ کا فیوز اُڑ گیا۔ اپنی شکایت کے نتیجے میں اس نے جو سزائیں ہمارے لئے تجویز کی تھیں، وہ اس کی نگاہ کے سامنے گھومنے لگیں۔

میں نے ایک سوال کئے بغیر اسے حوالدار مبارک علی کے حوالے کر دیا۔ مبارک علی نے سکندر شاہ کی جانب کچھ اس انداز میں اشارہ کیا، جیسے وہ کوئی بے کار سی شے ہو، پھر مجھ سے پوچھا۔ مجھے اس کے انداز سے اندازہ ہو گیا کہ وہ ان لوگوں سے خوش نہیں تھا۔

''ملک صاحب! اس کا کیا کرنا ہے؟'' حوالدار کے لہجے میں ناپسندیدگی کی جھلک تھی۔

میں نے کہا۔

''مبارک علی! کیا تم سکندر شاہ چیلا آف قلندر شاہ المعروف بہ جھاڑو والی اینڈ بادام والی سرکار وغیرہ کو نہیں جانتے؟ بھئی یہ ہمارے خاص مہمان ہیں۔ انہیں مہمان خانے میں ٹھہراؤ، ان کی خاطر داری کے انتظامات کا جائزہ لو اور انہیں وہ سب کچھ دکھا بھی دو۔ نوع بہ نوع آئٹمز کو دیکھ کر ان کی طبیعت سرشار ہو جائے گی۔ لیکن ابھی کھانا

چننے کی ضرورت نہیں۔ میں ایک دو ضروری کام کرلوں، پھر پروگرام شروع کریں گے۔ ویسے بھی جب تک ہمارے مہمانِ خصوصی سائیں قلندر شاہ یہاں تشریف فرما نہیں ہو جاتے، دستر خوان کیسے بچھایا جا سکتا ہے؟..... ہے نا؟''

حوالدار نے اپنے سر کو معنی خیز اثباتی جنبش دی اور کہا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، ملک صاحب! جب تک اس کا گرو وہ حاضر نہیں ہو جاتا، ہم کوئی کارروائی کیسے کر سکتے ہیں؟''

سکندر شاہ ہماری طنزیہ، نکیلی، کٹیلی اور ہڈیوں تک اُتر جانے والی معنی خیز باتوں کو سن کر پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے اس کی پریشانی میں اضافہ کرتے ہوئے مبارک علی سے کہا، میرا انداز سمجھانے والا تھا۔

''بھئی! تم سکندر شاہ کے گرو کو حاضر کرنے کے لئے جو بھی نیلا، پیلا، لال، ہرا عمل کرو، اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا کہ چیلا جی کی سلامتی کو نسل کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے چھوٹے شاہ صاحب سے ابھی بہت سے ضروری کام نکلوانے ہیں۔''

''آپ فکر نہ کریں، ملک صاحب!'' حوالدار، سکندر شاہ کو کسی قصاب کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ آپ کی امانت ہے۔ میں شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری دیانت داری کے ساتھ اس میں کوئی خیانت نہیں کروں گا۔''

سکندر شاہ کے چہرے پر زردی نمودار ہونے لگی۔

❁.....❁

میں نے پہلی فرصت میں یہ کام کر دیا تھا کہ کانسٹیبل محمد اقبال اور کانسٹیبل بشیر حسین کو سادہ لباس میں آستانے کی جانب روانہ کر دیا۔ انہیں میں نے تاکید کی تھی کہ وہ گھوم پھر کر آستانے کے داخلی اور خارجی راستے پر نظر رکھیں اور اگر سائیں قلندر شاہ اپنے آستانے سے باہر قدم نکالنے کی کوشش کرے تو نہایت ہی خفیہ انداز میں اس کا تعاقب کریں، اسے خوامخواہ چھیڑنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر وہ یہ محسوس کریں کہ سائیں چالاکی سے کہیں فرار ہونے کا ارادہ رکھتا ہے تو پھر اس کے



فرار کو ناکامیاب بنانے کے لئے وہ کوئی بھی سنگین قدم اُٹھا سکتے ہیں۔ لیکن ہر صورت میں سائیں قلندر شاہ مجھے زندہ حالت میں ملنا چاہئے۔

اقبال اور بشیر صحت اور طاقت کے اعتبار سے ایسے تھے کہ بہ آسانی سائیں کو قابو کر سکتے تھے۔

سکندر شاہ کے مطابق، سائیں اپنے حجرے میں محوِ استراحت تھا اور ابھی فوری طور پر اس کی بیداری کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بشرطیکہ سخیا معقولیت کا مظاہرہ کرتا۔ اگر وہ میرے کہنے کا یقین کر لیتا کہ سکندر شاہ تھوڑی دیر میں آستانے پر واپس آ جائے گا تو پھر وہ سائیں کی طرف سے بے فکر ہو سکتا تھا۔ لیکن اگر اس کے ذہن میں مہم جوئی کا خیال آ جاتا تو وہ فوراً سائیں کو بیدار کر کے اس واقعے کی اطلاع دے سکتا تھا۔ بہرحال، اس سلسلے میں فی الحال حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

میں اپنے کمرے میں بیٹھا صورتِ حال پر غور کر رہا تھا کہ اللہ بخش کا چھوٹا بھائی نبی بخش تھانے پہنچ گیا۔ وہ آج صبح اپنے سالوں کی معیت میں اپنے بھتیجے قادرا کی تلاش میں نکلا تھا اور میری ہدایت کے مطابق، اسے جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد جا کر اپنے رشتے داروں کے ہاں قادرا کو ڈھونڈنا تھا۔ میں نے فوراً نبی بخش کو اپنے کمرے میں بلا لیا۔

وہ عصر اور مغرب کے بیچ کا وقت تھا۔ میری طلبی پر نبی بخش کمرے میں آ گیا۔ میں نے اس کے عقب میں نگاہ دوڑائی تو وہ فوراً سے پیشتر میری تشویش کو بھانپ گیا، جلدی سے بولا۔

''میں نے اپنے سالوں کو گھر بھیج دیا ہے، تاکہ بھائی اللہ بخش کو اطلاع دے دیں کہ ہم اپنے مشن سے واپس آ گئے ہیں سائیں میں سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں، تھانیدار صاحب!''

''مشن سے واپس تو آ گئے ہو، لیکن تمہارے لٹکے ہوئے چہرے سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تمہیں اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا اندازہ غلط تو نہیں، نبی بخش؟''

''نہیں جناب!..... آپ نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔'' وہ تھکی ہوئی آواز

میں بولا۔ ''خاطر خواہ نہیں، بلکہ ہمیں سرے سے کامیابی ہوئی ہی نہیں۔ ہم نامراد واپس لوٹ آئے ہیں۔''

''نااُمیدی اور نامرادی میں تھوڑا فرق ہوتا ہے، نبی بخش!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم نامراد ضرور لوٹے ہو، لیکن تمہیں نااُمید نہیں ہونا چاہئے۔ بتاؤ مجھے، وہاں کی کیا رپورٹ ہے؟''

وہ ٹوٹی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

''تھانیدار صاحب! ہم نے ہر جگہ جا کر دیکھ لیا۔ سلمٰی، کریم بخش اور قادرا کے نانکے میں ایک ایک آدمی سے پوچھ لیا ہے، لیکن کہیں سے کوئی اچھی خبر نہیں ملی۔ ان سب کا یہی کہنا ہے کہ قادرا وہاں نہیں آیا۔ نہ تو اکیلا اور..... نہ ہی کسی کے ساتھ۔''

وہ لمحے بھر کو متوقف ہوا، ایک بوجھل سانس خارج کی اور اپنی رپورٹ کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آپ جانتے ہیں کہ جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد تین الگ الگ کونوں میں ہیں۔ ہم نے اپنی کوشش کر کے دل کو تسلی دے لی۔ لیکن اس طرح کہاں دل کو اطمینان ہوتا ہے جناب!..... ہم نے جہاں جہاں قادرا کی گمشدگی کے بارے میں بتایا، وہ لوگ بھی پریشان ہوئے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ.....''

وہ ایک مرتبہ پھر رک گیا۔ بولتے بولتے اس کی آواز بھرّا گئی تھی۔ چند لمحات تک خاموش رہنے کے بعد بوجھل لہجے میں بتانے لگا۔

''آپ کہتے ہیں کہ مجھے نااُمید نہیں ہونا چاہئے..... تو اب یہی آخری سہارا ہے۔ سنا ہے، یہ دنیا امید پر قائم ہے.....''

بولتے بولتے وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ میں اس کی تکلیف کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اسے اپنے بھتیجے قادر بخش عرف قادرا سے بڑی محبت تھی۔ بھائی کی اولاد سے ویسے بھی بہ نسبت زیادہ ہی لگاؤ ہوتا ہے۔ ''چاچا بھتیجا'' کی جوڑی کو مثالی سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ نبی بخش کی قادرا کے لئے چاہت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ابھی تک اس کی اپنی اولاد نہیں تھی۔

میں نے اس کی کیفیت کے پیش نظر کہا۔



''نبی بخش! تم نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔ یہ دنیا واقعی امید کے مرکز پر قائم و دائم ہے۔ امید، مرکز اور یقین محور و محیط ہے۔ جس انسان میں امید اور یقین کی قوت زندہ ہوتی ہے، وہ بڑی مشکل اور مصیبت کو پاؤں کی ٹھوکروں میں اُڑا سکتا ہے..... میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر تم امید کا دامن تھام کر رکھو گے تو کامیابی ایک دن ضرور تمہارے قدم چومے گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے جناب!'' نبی بخش نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی نصیحت پر عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔ لیکن یہ تو بتائیں، آپ یہاں پر قادرا کو تلاش کرنے کے لئے کیا عملی کوششیں کر رہے ہیں؟''

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں نپا تُلا جواب دیا۔

''اگرچہ ابھی تک میں قادرا کا کوئی واضح سراغ نہیں لگا سکا ہوں، لیکن یہاں کی کارروائی سے میں پوری طرح پُر اُمید اور مطمئن ہوں۔ مجھے یقین ہے، کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کامیابی میرے قدم چوم لے گی۔''

''اچھا..... آپ تو یہ بہت بڑی خوش خبری سنا رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ حیرت اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ بولا۔ ''ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے آپ نے کوئی اہم پوائنٹ تو پکڑ لیا ہے، لیکن ابھی اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا، تھانیدار صاحب؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے، نبی بخش!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کچھ ایسی ہی بات ہے۔''

''مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے؟'' وہ پُر اشتیاق نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''تم ایک عقل مند انسان ہو، نبی بخش!'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''جب تمہیں اندازہ ہے کہ میں قبل از وقت معاملے کو کھولنا نہیں چاہتا تو پھر تمہیں ایسی فرمائش کرنا ہی نہیں چاہئے۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ کہہ رہے ہیں تو میں ضد نہیں کروں گا۔ آپ تھانیدار ہیں، قانون اور تفتیش کو مجھ سے

زیادہ جانتے ہیں۔ کسی مصلحت کی بنا پر ہی تو ایسا کر رہے ہوں گے۔ اگر آپ فی الحال اس معاملے کو راز رکھنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"شاباش.....تم ایک معقول انسان ہو۔" میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

وہ بولا۔

"مجھے اجازت دیں جانے کی۔ اُدھر بھائی اللہ بخش میرا انتظار کر رہا ہوگا۔ میں ابھی گھر بھی نہیں گیا۔"

میں نے اپنے کمرے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ شام کے سائے پھیلنا شروع ہو گئے تھے۔ میں نے اس سے کہا۔

"نبی بخش! اگر اللہ بخش ہی سے ملنے جا رہے ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں یہیں پر تمہاری اس سے ملاقات کروا دیتا ہوں۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

"کیا بھائی اللہ بخش یہاں آنے والا ہے؟"

اس کے استفسار پر میں نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

"صرف بھائی ہی نہیں، بلکہ تمہاری بھابی بھی کچھ دیر میں یہاں پہنچنے....." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر نبی بخش کے عقب میں دیکھا اور با آواز بلند کہا۔

"لو دیکھو.....وہ دونوں پہنچ بھی گئے۔"

نبی بخش بے ساختہ گردن گھما کر پیچھے دیکھنے لگا۔

اللہ بخش حسب وعدہ سورج غروب ہونے سے قبل ہی اپنی گھر والی زاہدہ کے ہمراہ میرے پاس آ گیا تھا۔ زاہدہ دلکش حُسن کی مالک ایک پُرکشش عورت تھی۔ سائیں قلندر شاہ عرف جھاڑو والی سرکار کی نیت میں بال اور منہ میں رال کوئی ایسے ہی نہیں آئی تھی۔ وہ زاہدہ کے اُمڈتے جوبن پر اپنی ہوس کی جھاڑو پھیرنے کا مکمل پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔

ایک سنسنی خیز پروگرام میرے ذہن میں بھی ترتیب پا چکا تھا، جو سائیں عرف آوارہ بابا کے پروگرام کی ایسی کم تیسی کر کے رکھ دیتا۔

اپنی بھابی اور بڑے بھائی کو میرے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر نبی بخش فوراً



اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں بھی نبی بخش کو میرے پاس موجود پا کر چونک گئے تھے۔ شاید انہیں اس کی یہاں موجودگی کی توقع نہیں تھی۔ اللہ بخش نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں نبی بخش!.....کیا رہا اس طرف؟.....کیا میرے قادرا کا کچھ پتہ چلا؟"

زاہدہ نے کہا۔

"نبی بخش کے چہرے سے تو لگتا ہے، یہ ناکام لوٹا ہے.....اللہ خیر کرے..... میرا قادرا پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا ہے؟"

اس سے پہلے کہ نبی بخش اپنے بھائی اور بھاوج کے سوالات کے جواب میں زبان کھولتا، میں نے دونوں میاں بیوی کی جانب باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ لوگ اطمینان سے بیٹھو، پھر نبی بخش تمہیں صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہے۔"

وہ دونوں میری ہدایت کے مطابق، نبی بخش کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ نبی بخش انہیں جمال پور، تاج نگر اور کرم آباد سے متعلق اپنی اب تک کی کارکردگی سے آگاہ کرنے لگا اور میں خاموش نظروں سے زاہدہ کا جائزہ لینے لگا۔

اُس کے حُسن اور جوانی میں کوئی کلام نہیں تھا۔ وہ اس وقت تیس کے پیٹے میں تھی اور ماشاء اللہ دو بچوں کی ماں بھی تھی۔ قادر بخش عرف قادرا لگ بھگ دس برس کا تھا۔ قادرا سے چھوٹی ایک بیٹی تھی، اس کا نام خالدہ تھا اور اس کی عمر سات سال تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ زاہدہ کی شادی کو کم از کم گیارہ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق، اس کی شادی اٹھارہ اُنیس سال کی عمر میں ہوئی ہوگی۔ زاہدہ کی خوبصورتی اور دلکشی تو اپنی جگہ تھی ہی، اس پر مستزاد یہ کہ وہ خوب بن ٹھن کر بھی آئی تھی۔ گویا اس کے سراپا میں دو آتشہ کا تڑکا لگا ہوا تھا۔

ایک بات عموماً دیکھنے میں آئی ہے کہ اگر عورتوں کو کسی ڈاکٹر کے کلینک میں جانا ہو یا کسی پیر سائیں کے آستانے پر حاضری دینا ہو، وہ اپنے بناؤ سنگھار اور خوش لباسی میں کوئی کمی نہیں آنے دیتیں۔ اس کے برعکس شوہر کا قرب حاصل کرتے وقت وہ زیادہ تر ایسے لباس میں ملبوس ہوتی ہیں، جس سے لہسن پیاز اور مختلف چٹنیوں کی مخصوص باس اُٹھ رہی ہوتی ہے۔ میرا بیان کردہ یہ فارمولا ہر خاص و عام بیوی پر لاگو نہیں ہوتا۔ میں

ان معدودے چند بیویوں سے انتہائی معذرت خواہ ہوں، جو اپنے شوہروں کی خواہش اور حسِ لطیف کا پورا خیال رکھتی ہیں..... میں نے اوپر جو کچھ بھی کہا، وہ ان سے متعلق نہیں ہے!

پانچ منٹ کے اندر نبی بخش نے اپنے بھائی اور بھاوج کو تازہ ترین صورتِ حال سے آگاہ کر دیا تو میں نے اس سے کہا۔

''نبی بخش! تم تھوڑی دیر کے لئے باہر جا کر برآمدے میں بیٹھو۔ میں ابھی تمہیں اپنے پاس بلاتا ہوں۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔''

وہ کوئی سوال کئے بغیر اٹھا اور خاموش قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ میں نے اللہ بخش اور زاہدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تو تم لوگ تیار ہو کر آ گئے ہو؟''

''جی تھانیدار جی!'' اللہ بخش نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''آپ کا حکم تھا، آستانے کی طرف جانے سے پہلے آپ سے ملتے ہوئے جائیں، اس لئے ہم تھانے آئے ہیں۔'' وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''آپ نے سائیں صاحب کے لئے کوئی تحفہ وغیرہ دینے کی بات کی تھی!

''ہاں..... وہ تحفہ میں نے منگوا لیا ہے۔'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر زاہدہ کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد اللہ بخش سے پوچھا۔

''کیا تمہاری گھر والی پہلے بھی سائیں جی کے آستانے پر جاتی رہتی ہے یا آج پہلی مرتبہ.....''

اللہ بخش کے بجائے زاہدہ نے ترت جواب دیا۔

''تھانیدار جی! میں اس سے پہلے صرف ایک بار ادھر آستانے پر گئی ہوں، آج دوسری مرتبہ جا رہی ہوں۔''

مجھے یہ اندازہ لگانے میں قطعاً کوئی دشواری نہ ہوئی کہ سائیں قلندر شاہ، زاہدہ کے دلکش سراپا کو دیکھ کر پھڑک گیا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، اس وقت زاہدہ کی پریشانی اور موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے بہانے سے اسے اپنے آستانے پر بلایا ہو۔ اگر ایسا ہی تھا



تو پھر یہ بھی طے تھا کہ زاہدہ چند روز پہلے ہی آستانے پر گئی ہوگی۔ ورنہ پیر بادام شاہ عرف جھاڑو والی سرکار اتنے دن صبر کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے اپنے خیال کی تصدیق کے لئے زاہدہ سے پوچھ ہی لیا۔

''زاہدہ! یہ کتنا عرصہ پہلے کی بات ہے، جب تم سائیں صاحب سے ملنے گئی تھیں؟''

اس نے میرے اندازے کے عین مطابق جواب دیا۔

''دس دن پہلے جی۔''

''اور حاجت کیا تھی.....؟'' میں نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے، تم کس مقصد سے وہاں گئی تھیں؟''

''وہ جی.....'' وہ متاملانہ انداز میں بولی۔ ''میں جی گھر کی اور دکان کی خیر و برکت کے لئے سائیں صاحب سے دعا کروانے گئی تھی۔''

''انہوں نے تمہارے حق میں دعا کر دی ہوگی؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی..... جی ہاں!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''اور تمہیں یقین ہے، سائیں جی کی دعا میں بڑا اثر ہے؟''

''بالکل جی.....'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولی۔ ''اسی لئے تو قادرا کے سلسلے میں، میں دم کرانے سائیں جی کے حجرے میں جا رہی ہوں۔'' وہ ایک لمحے کے لئے رُکی، پھر بڑے یقین سے بولی۔

''سائیں جی خیر و برکت کے لئے جو دعا کی تھی، اس نے بہت اثر دکھایا تھا اور مجھے امید ہے، سائیں جی قادرا کی گمشدگی کے بارے میں بھی ہماری مدد ضرور کریں گے۔''

''اللہ کرے، ایسا ہی ہو۔'' میں نے زاہدہ کا دل رکھنے کے لئے نیم دلی سے کہا۔

اللہ بخش نے تہ دل سے کہا۔ ''آمین!''

میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔ دس روز پہلے جھاڑو والی سرکار نے زاہدہ کے ہوش ربا حُسن کا نظارہ کیا تھا اور جبھی سے وہ اس کے تصور پر رال ٹپکا رہا ہوگا۔ قادرا کی

گمشدگی نے سائیں کو موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ بہانے بہانے اپنی ہوس کی ضیافت کا اہتمام کر ڈالے۔ بہرحال، میں نے تھانے کے ٹرائل روم میں سائیں کی خاطر مدارات کے لئے بڑے زبردست انتظامات کے بارے میں سوچ رکھا تھا۔

''اب ہمارے لئے کیا حکم ہے، تھانیدار جی؟'' اللہ بخش نے میری جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔

''آپ لوگ سائیں جی کے آستانے پر جاؤ۔ مجھے بھی امید ہے، سائیں جی قادرا کی تلاش کے سلسلے میں ضرور تمہاری رہنمائی کریں گے۔''

میں نے کچھ دیر پہلے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر ایک سیر مکس مٹھائی منگوالی تھی۔ اللہ بخش اور زاہدہ کو رخصت کرنے سے پہلے میں نے مٹھائی والا وہ ڈبہ ان کے حوالے کر دیا۔

اللہ بخش نے پوچھا۔

''یہ تحفہ سائیں جی کے لئے ہے نا؟''

''ہاں.....'' میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''یہ محبت اور خلوص بھرا چھوٹا سا نذرانہ ہے۔ تم سائیں جی کو میرا سلام کہنا اور یہ عرض کرنا کہ میں بہت جلد ان کی قدم بوسی کے لئے آستانے پر حاضری دوں گا۔''

وہ جانے لگے تو زاہدہ نے تشویش بھرے لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''تھانیدار جی! آپ نے کسی ضروری کام کے لئے نبی بخش کو ادھر ہی روک رکھا ہے۔ خیریت تو ہے نا؟''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بالکل خیریت ہے۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ''بس، تھوڑی ہدایت تاکید کے بعد میں اسے گھر کی طرف روانہ کر دوں گا۔ تم لوگ اطمینان سے آستانے پر جاؤ۔''

اور وہ چلے گئے۔

میں نے نبی بخش کو دوبارہ اپنے پاس بلا لیا۔ پہلے جب وہ میرے سامنے آیا تھا تو مجھے اس کی آنکھوں اور چہرے پر تھکن اور ناکامیابی کے تاثرات نظر آئے تھے اور اب



ان تاثرات میں گہری تشویش اور تفکر بھی شامل ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی سوال کر دیا۔

''نبی بخش! جاتے وقت اللہ بخش نے تم سے کوئی بات کی تھی؟''

''نہیں جی..... انہوں نے تو میری طرف دیکھا بھی نہیں۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''بس خاموشی سے چلے گئے۔ لگتا ہے، ان کی مجھ پر نظر ہی نہیں پڑی۔''

وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے متوقف ہوا، پھر اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ لوگ کہاں گئے ہیں جی؟ بھابی تو خاصی تیار شیار تھی؟''

''تمہارا کیا اندازہ ہے؟'' میں نے اُلٹا اسی سے پوچھ لیا۔ ''وہ کہاں گئے ہوں گے؟''

''انہیں گھر ہی جانا چاہئے، لیکن.....''

وہ بولتے بولتے سوالیہ انداز میں رک گیا تو میں نے اس کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

''نبی بخش! تمہارا بڑا بھائی اور بھابی، پیر بادام شاہ کے آستانے پر گئے ہیں۔''

''اس وقت..... کیوں؟'' وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اس وقت، کیا مطلب؟'' میں نے تعجب خیز انداز میں پوچھا۔ ''کیا سائیں جی کے آستانے پر حاضری دینے کا کوئی خاص وقت مقرر ہے؟''

''یہ بات نہیں ہے جناب!'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''دراصل اب تو شام ہونے والی ہے، اور قادرا کی بھی کوئی خیر خبر نہیں۔''

''وہ قادرا کی خیر خبر ہی ڈھونڈنے تو وہاں گئے ہیں۔'' میں نے نبی بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔ ''سائیں جی نے خاص طور پر تمہاری بھابی کو آج رات آستانے پر بلایا ہے۔ وہ زاہدہ پر کوئی دم کریں گے، جس سے پتہ چل جائے گا کہ قادرا کہاں ہے؟''

''سب بکواس ہے۔'' وہ با آواز بلند چلایا، پھر فوراً ہی سنبھل کر معتدل لہجے میں بولا۔ ''بھائی اللہ بخش کو اکیلے وہاں جانا چاہئے تھا۔''

میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

''نبی بخش! تم نے چلّا کر ''بکواس'' والا جو جملہ بولا ہے نا، وہ مجھے پسند آیا ہے۔ ذرا اس پر روشنی ڈالو۔''

''کیا.....؟'' وہ آنکھیں سکوڑ کر مجھے دیکھنے لگا۔ ''وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔''

میں نے کہا۔

''نبی بخش! تم نے ایسے کہا تھا، ویسے کہا تھا یا جیسے تیسے کہا تھا، لیکن میں تم سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ یہ جھاڑو والی سرکار اور اس کا آستانہ سب بکواس ہے۔ تمہاری بھابی کو یوں بن ٹھن کر رات کے وقت وہاں نہیں جانا چاہئے۔ مگر تم فکر نہ کرو، میں اس سلسلے میں بالکل غافل نہیں ہوں۔ اِن شاء اللہ! میں تمہاری بھابی اور بھائی کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

وہ تشکر آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''اس کا مطلب ہے، آپ کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ تیار ہے؟''

''تمہارا اندازہ بالکل درست ہے، نبی بخش!'' میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تم سے کہا تھا نا..... کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے کامیابی میرے قدم چومے گی۔ دیکھ لینا، ایسا ہی ہوگا۔''

لمحاتی توقف کے بعد میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''نبی بخش! ابھی ابھی میں نے ایک اور فیصلہ کیا ہے۔ تم زیادہ تھکے ہوئے تو نہیں ہو؟''

وہ سنسناتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

''نہیں جی..... حکم؟''

''میں سادہ لباس میں سائیں بادام شاہ کے آستانے پر جانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اس مشن میں میرے ساتھ رہو۔''

''میں آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہوں جناب!'' وہ پُرعزم لہجے میں بولا۔



میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں اسے اپنے شکوک و شبہات اور پروگرام سے آگاہ کیا اور سکندر شاہ کے حوالے سے بھی تفصیلاً بتانے کے بعد کہا۔

''سائیں کا چیلا اس وقت میرے تھانے کی حوالات میں بند ہے۔ مجھے شک ہے کہ قادرا کی گمشدگی میں سکندر شاہ کا ہاتھ ہے اور اسی سلسلے میں جھاڑو والی سرکار نے تمہاری بھابی کو اپنے حجرے میں بلایا ہے تو اس سے اشارہ ملتا ہے کہ خود سائیں بھی اس سازش میں برابر کا شریک ہے.....''

''اگر سائیں نے میری بھابی کو ہاتھ بھی لگایا تو میں اس کی گردن دبا دوں گا۔'' میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''پتہ نہیں، بھائی اللہ بخش کو کیا ہوگیا ہے۔ عقیدت میں انسان کو اتنا اندھا بھی نہیں ہونا چاہئے کہ.....''

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر دائیں ہاتھ کا ایک زوردار مُکا برسایا، پھر ہونٹ بھینچ کر میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نبی بخش! تمہارا یہ جوش مجھے پسند آیا ہے۔ لیکن اس جوش کے ساتھ ہی ہوش کی بھی ضرورت ہے، ورنہ بنا بنایا کھیل بگڑ کر رہ جائے گا۔''

اس نے معنی خیز انداز میں میری طرف دیکھا اور اثبات میں گردن ہلانے لگا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''نبی بخش! اب توجہ سے سنو، ہمیں کرنا کیا ہے۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوگیا۔

❁.....❁

جھاڑو والی سرکار کے آستانے میں داخل ہونے کے لئے ایک ہی دروازہ تھا، جس سے گزر کر میں اور کانسٹیبل اقبال اندر پہنچے تھے۔ جب کہ آستانے سے خروج کے لئے دو راستے موجود تھے۔ ایک تو یہی داخلی دروازہ اور دوسرا سائیں کے حجرے کا عقبی دروازہ جو پیچھے نہر کی سمت کھلتا تھا۔ یہ دروازہ صرف قبلہ بادام شاہ ہی کے تصرف میں تھا۔

جب میں اور نبی بخش آستانے کے قریب پہنچے تو ہلکا اندھیرا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے کانسٹیبل اقبال اور بشیر حسین کو سادہ لباس میں آستانے کی نگرانی پر مامور کر رکھا تھا۔ اقبال نے مجھے دور ہی سے دیکھ لیا اور محتاط قدموں سے چلتے ہوئے میرے پاس آ گیا۔

میں نے اس سے پوچھا۔

''ہاں بھئی اقبال!.....بشیر حسین کدھر ہے؟''

''وہ آستانے کے پچھلے حصے میں پہرہ دے رہا ہے۔'' اقبال نے بتایا۔ ''جدھر حجرے کا عقبی دروازہ کھلتا ہے۔''

''کیا رپورٹ ہے؟'' میں نے اقبال کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

جواب دینے سے پہلے وہ تھوڑا سا ہچکچایا اور متاملانہ نظروں سے نبی بخش کی طرف دیکھنے لگا۔ میں فوراً سے پیشتر اس کی ہچکچاہٹ کے سبب تک پہنچ گیا اور اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

''نبی بخش اس مشن میں ہمارے ساتھ ہے۔ تم اس کے سامنے زبان کھول سکتے ہو۔''

کانسٹیبل اقبال کا تعلق چونکہ رتن گڑھ ہی سے تھا، لہٰذا وہ اللہ بخش، نبی بخش، قادرا اور زاہدہ کو اچھی طرح جانتا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اللہ رکھا اور زاہدہ کے حوالے سے کچھ بتانے جا رہا تھا کہ نبی بخش کی وہاں موجودگی نے اس کی گویائی کو بریک لگا دیئے تھے۔ میری طرف سے گرین سگنل ملنے کے بعد اس نے کہا۔

''ملک صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے اللہ بخش اور اس کی بیوی زاہدہ، آستانے کے اندر گئے ہیں۔''

''ہوں.....!'' میں نے پُرمعنی انداز میں ہنکارا بھرا اور پوچھا۔ ''تو اس کا مطلب ہے، ہمارے ایکشن میں آنے کا وقت آ گیا ہے.....اس وقت اللہ بخش اور زاہدہ کے علاوہ آستانے کے اندر اور کون کون ہے؟''

''صرف پیر فرتوت سائیں جھاڑو والا.....'' اقبال نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔



''اور سخی عرف سخیا کہاں ہے؟'' میں نے چونکے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آپ کے آنے سے تھوڑی دیر پہلے اللہ بخش اور زاہدہ یہاں پہنچے ہیں اور ان کی آمد کے پانچ منٹ بعد ہی سخیا آستانے سے نکل کر کہیں گیا ہے۔ آپ نے چونکہ سائیں پر توجہ دینے کی خصوصی ہدایت کی ہوئی ہے، لہٰذا ہم نے سخیا کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پتہ نہیں، آپ کو یہ بات پسند آئے گی یا نہیں۔''

''پسند اور ناپسند کے بارے میں سوچنے کی مہلت نہیں ہے اقبال!'' میں نے اضطراری انداز میں کہا۔ ''سائیں بادام شاہ پر دھاوا بولنے کے لئے یہ مناسب وقت ہے۔''

''جو حکم ملک صاحب!'' اقبال نے فرمانبرداری سے کہا۔

میں نے نبی بخش کا سرتا پا جائزہ لیا۔ وہ ایک صحت مند اور جوان شخص تھا۔ میں نے باری باری نبی بخش اور اقبال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں ادھر ہی آستانے کے داخلی دروازے کے آس پاس موجود رہو گے۔ اگر سائیں افراتفری کے انداز میں اس طرف آتا دکھائی دے تو تم اسے اچھی طرح قابو کر لینا۔ میرا خیال ہے، تم دونوں اسے بہ آسانی کنٹرول کر لو گے۔''

''اس سائیں کو کنٹرول کرنے کے لئے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں، تھانیدار صاحب!'' نبی بخش نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''آپ مجھے اپنے ساتھ اندر لے چلیں۔''

میں نبی بخش کے جوش اور ولولے کا اندازہ لگا چکا تھا اور سائیں کے لئے اس کی ناپسندیدگی کو بھی اچھی طرح محسوس کر چکا تھا۔ اندر اس کی بھابی، سائیں کے حجرے میں تھی اور یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ زاہدہ کس حالت میں ہو گی۔ میں نبی بخش کو اندر لے جانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ وہاں کوئی جذباتی تصادم بھی پیش آ سکتا تھا۔

میں نے نبی بخش کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''میں تمہارے جذبات کو اچھی طرح سمجھ رہا ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔ اگر میں ضرورت

محسوس کروں گا تو سب سے پہلے تمہی کو آواز دوں گا۔"

میری نصیحت کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ خاصا شانت نظر آنے لگا۔ میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔

"تم دونوں کا آستانے کے دروازے پر موجود رہنا بہت ضروری ہے۔ نخیا پتہ نہیں، کہاں گیا ہے؟ سائیں نے اسے کس کام سے بھیجا ہے؟ ممکن ہے، واپسی میں اس کے ساتھ کچھ دوسرے لوگ بھی ہوں۔ تم دونوں ہو گے تو ان کے ساتھ نمٹنا آسان ہو جائے گا۔ پھر سکندر شاہ بھی ادھر تھانے کی حوالات میں بند ہے....."

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا، پھر حتمی لہجے میں کہا۔ "بس، تم دونوں یہاں چوکنا رہو۔ میں اندر جا رہا ہوں۔"

پھر دونوں جوانوں کو وہیں چھوڑ کر میں آستانے کے اندر داخل ہو گیا۔ میں دن میں بھی یہاں کا ایک چکر لگا کر گیا تھا، جب میں اور اقبال، سکندر شاہ کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ تھانے لے گئے تھے۔ میں نے اس موقع پر گھوم پھر کر آستانے کے اندرونی محل وقوع کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا تھا، تاکہ رات کو کسی دشواری کا سامنا نہ ہو۔ اور واقعی.....اس وقت مجھے کوئی دقت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

جلد ہی میں اس ہال نما کمرے کے نزدیک پہنچ گیا، جہاں دن میں پیر سائیں اپنے ارادت مندوں کو اپنا دیدار کرایا کرتے تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے جھانک کر ہال کے اندر دیکھا۔

لالٹین کی مخصوص روشنی میں، ہال کے اندر مجھے اللہ بخش بیٹھا دکھائی دیا اور وہ بالکل اکیلا تھا۔ اس کا واضح مطلب یہی تھا کہ سائیں، زاہدہ کو "دم" کرنے کے لئے اپنے حجرۂ خاص میں لے جا چکا ہے۔ میرے تن بدن میں ایک کرنٹ سا دوڑ گیا اور میں بلی کے مانند دبے قدموں سائیں کے حجرے کی طرف بڑھ گیا، جو اس ہال کے عقب میں واقع تھا۔

اللہ بخش اور نبی بخش کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اللہ بخش، سائیں کی عقیدت اور احترام میں گھٹنے گھٹنے بلکہ گردن گردن دھنسا ہوا تھا، جبکہ نبی بخش، سائیں پر بھروسہ نہیں کرتا تھا۔ اسی کی زبانی راستے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ رتن گڑھ آنے سے



پہلے جھاڑو والی سرکار موضع کوٹ مکھن میں ہوا کرتا تھا۔ وہاں اس کے آستانے پر کوئی سنین پارٹ ہو گیا تھا، جبھی اسے کوٹ مکھن سے فرار ہونا پڑا تھا۔ نبی بخش کو اس بات کا بڑا قلق تھا کہ اس کا بڑا بھائی خوامخواہ سائیں کے چکر میں پھنسا ہوا تھا۔

جلد ہی میں سائیں کے حجرے کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے پلک جھپکتے میں گھوم پھر کر حجرے کے دونوں دروازوں کا جائزہ لے لیا۔ عقبی دروازے کے اوپر ایک روشن دان بھی نظر آ رہا تھا، جو کھلا ہوا تھا۔ حجرے کے اندر کا نظارہ کرنے کے لئے یہ مناسب مقام تھا۔

میں بڑی احتیاط کے ساتھ حجرے کی چھت پر پہنچا اور اوپر سے جھک کر، یعنی اُلٹا لٹک کر حجرے کے اندر جھانکا۔ حجرے میں دیے کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اسی روشنی میں، میں نے زاہدہ کو حجرے کے عین وسط میں چٹائی پر بے ہوش پڑے دیکھا۔ وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے پاس ہی ایک مکروہ چہرے والا شخص بھی موجود تھا، جو ایک سو ایک فیصد سائیں ہی تھا۔ زاہدہ کی بے ہوشی کا یہی سبب سمجھ میں آیا کہ سائیں نے اُسے کوئی ایسی شے کھلائی یا پلائی ہو گی، جس نے زاہدہ کو خود سے غافل کر دیا۔ وہ اسی غفلت کے دوران زاہدہ کے شباب سے فیض یاب ہونے کا ارادہ رکھتا تھا اور یہ ارادہ اس کی حرکات وسکنات سے بھی عیاں تھا۔ وہ للچائی ہوئی نظروں سے زاہدہ کے بدن کو دیکھ رہا تھا۔

میں بروقت وہاں پہنچا تھا۔ اگر مجھے پانچ دس منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو سائیں اپنے پروگرام پر عمل کر چکا ہوتا۔ اس سے پہلے کہ سائیں، زاہدہ کے بدن کو چھوتا، میں نے روشن دان کے قریب منہ لے جاتے ہوئے بڑے بھیانک انداز میں ایک قہقہہ لگایا۔

سائیں اس طرح اُچھلا جیسے اس نے بجلی کے ننگے تار کو چھو لیا ہو۔ میکانکی انداز میں اس نے پلٹ کر حجرے کے عقبی دروازے کی سمت دیکھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ بھیانک قہقہہ اس دروازے کے پیچھے سے اُبھرا ہے۔ میں نے دیکھا، ایک لمحے کے تذبذب کے بعد وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے مذکورہ دروازے کی جانب بڑھا تھا۔

وہ بہت نازک لمحات تھے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا، وہ دروازہ کھول کر باہر کا جائزہ بھی لے گا۔ میں بہ آہستگی نیچی چھت والے حجرے سے نیچے اُتر آیا اور دروازے کے سامنے جم کر کھڑا ہو گیا۔

مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میری توقع کے عین مطابق، حجرے کا دروازہ کھلا اور وہاں سے سائیں کی چربیلی گردن نمودار ہوئی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کی کھوپڑی پر ایک بھرپور ٹھوکر ماری۔

پاؤں کی یہ ضرب اتنی شدید اور بھرپور تھی کہ وہ اُلٹ کر حجرے کے اندر گرا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہی حجرے میں پہنچا اور اسے ہاتھ پاؤں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ سائیں پر گویا اچانک ایک افتاد سی ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ کوئی کمزور شخص نہیں تھا، لیکن پہلے میرے بھیانک قہقہے نے اور ازاں بعد میرے تابڑ توڑ حملوں نے اس کی مت مار کر رکھ دی تھی۔ سنبھلنے کی کوشش میں وہ مجھ سے پٹتا چلا گیا۔ جب تک اس کی سمجھ میں یہ آتا کہ اس کے ساتھ فی الواقعہ ہوا کیا ہے، میں زیر کر کے اسے زمین چاٹنے پر مجبور کر چکا تھا۔

حجرے کے روشن دان میں، میں نے جو بھیانک اور لرزہ خیز قہقہہ لگایا تھا، اس کی دہشت اور خوف ناکی حجرے کی اندرونی فضا تک ہی محدود نہیں رہی تھی، بلکہ یہ آواز اقبال، نبی بخش، اللہ بخش اور بشیر حسین نے بھی سنی تھی۔ نہ صرف سنی تھی، بلکہ وہ صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے دوڑتے ہوئے ''جائے وقوعہ'' پر بھی پہنچ گئے تھے۔ سائیں کو زخم خوردہ اور خستہ حال دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ میں نے اقبال اور بشیر حسین کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔

''اس پیر فرتوت، سیاہ کرتوت کو فوراً گرفتار کر لو۔'' میرا اشارہ جھاڑو والی سرکار کی جانب تھا۔ ''باقی کی خاطر تواضع تھانے جا کر ہو گی، جہاں اس کا چیلا سکندر شاہ بھی میری میزبانی کا لطف اٹھا رہا ہے۔''

سائیں نے قہر آلود نگاہ سے میری طرف دیکھا اور دھمکی آمیز لہجے میں بولا۔

''تم جو کوئی بھی ہو، اچھا نہیں کر رہے ہو۔''

''میں، جو کوئی نہیں، بلکہ ملک صفدر حیات ہوں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں



آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''اس علاقے کا تھانیدار.....اور یہ مت سمجھنا کہ کوٹ مکھن کی طرح تم یہاں سے بھی بچ کر نکل جاؤ گے۔ قادرا کا اغوا اور زاہدہ کی آبرو ریزی کی کوشش..... یہ ایسے ''کارنامے'' ہیں تمہارے کہ باقی کی ساری زندگی تم جیل کی سلاخوں کے پیچھے گزارو گے۔''

''کک.....کیا مطلب؟'' وہ بکھری ہوئی آواز میں بولا۔

''مطلب تھانے پہنچ کر تم پر واضح ہو جائے گا۔'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

اس دوران اللہ بخش اور نبی بخش کوشش کر کے زاہدہ کو ہوش میں لے آئے تھے۔ آستانے پر مزید رکنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سخیا کی واپسی اور گرفتاری کے لئے بشیر حسین اور اقبال کو وہیں چھوڑا اور سائیں کو گرفتار کر کے تھانے لے آیا۔ اللہ بخش اینڈ کمپنی کو میں نے ان کے گھر بھیج دیا اور ہدایت کر دی کہ دونوں بھائی صبح تھانے آ کر مجھ سے ملیں۔ زاہدہ کو آرام کی ضرورت تھی اور یہ شے اسے اپنے گھر ہی میں میسر آ سکتی تھی۔

میں نے تھانے میں قدم رکھا تو ایک سنسنی خیز انکشاف میرا منتظر تھا۔ سخیا بھی سکندر شاہ کے ساتھ حوالات میں بند تھا۔ وہ سکندر شاہ کو تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا اور مبارک نے اسے پکڑ کر بند کر دیا تھا۔ حوالدار مبارک علی کی محنت رنگ لے آئی تھی۔ اس نے سکندر شاہ سے اقبالِ جرم کروا لیا تھا۔ قادرا کو اسی نے اغوا کر کے آستانے پر پہنچایا تھا۔ اس کے بعد قادرا کے ساتھ کیا ہوا، یہ بہت ہی افسوس ناک بلکہ شرم ناک واقعہ ہے.....!

یہ دراصل سائیں اور اس کے چیلے کا مشترکہ منصوبہ تھا۔ انہوں نے قادرا اور اس کی ماں زاہدہ کو ایک ہی جال میں پھانسنے کا پروگرام ترتیب دیا تھا۔ قادرا بھی اپنی ماں کی طرح گورا چٹا اور خوب صورت لڑکا تھا۔ سکندر شاہ کی قادرا پر اور سائیں کی زاہدہ پر نیت خراب ہو گئی تھی اور اسی خرابی نیت کے نتیجے میں یہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا تھا، جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے، کم ہے۔ سائیں کو پتہ تھا، قادرا کی گمشدگی کے سلسلے میں اللہ بخش ضرور اس کے پاس آئے گا، پھر وہ آسانی سے اس کی خوب رو بیوی زاہدہ کو شکار کر لے گا۔

سب کچھ منصوبے کے عین مطابق ہوا تھا۔لیکن میری بروقت مداخلت نے سائیں کو اپنے مذموم عزائم میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا۔مگر.....مجھے اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ میں قادرا کے لئے کچھ نہ کر سکا۔

قادرا، سکندر شاہ کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔صبح ہونے سے پہلے سکندر شاہ نے معصوم قادرا کی لاش کو نہر کے کنارے ایک جگہ دبا دیا۔سکندر شاہ کی نشان دہی پر میں نے اگلے روز قادرا کی لاش دریافت کر لی۔

اس واقعے پر قادرا کے ماں باپ کا جو حال تھا، سو تھا، لیکن میں خود بھی اندر سے ہل کر رہ گیا تھا۔سکندر شاہ، گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا تھا۔اسے جتنی بھی عبرت ناک سزا دی جاتی، کم تھی۔ میں نے اسے ٹھیک ٹھاک فٹ کرنے کے لئے پورا زور لگا دیا تھا۔

ذہین قارئین اندازہ لگانے کی کوشش کریں کہ میں نے سائیں اور اس کے چیلے کے ساتھ کیا ''سلوک'' کیا ہوگا.....؟

(تمت بالخیر)